ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

برائے فروخت

محمد حامد سراج

ساقیٔ اربابِ ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

برائے فروخت

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

محمد حامد سراج

پورب اکادمی، اسلام آباد

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

©: 2009ء پورب اکادمی

طبع دوم: جون 2009ء

ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد

فون نمبر: 051 - 5819410, 0301 - 55958 61

ای میل: poorab_academy@yahoo.com

ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

پتہ مصنف: ڈاکخانہ چشمہ بیراج، ضلع میانوالی (پوسٹ کوڈ 42030)

فون نمبر: 0459-805125, 0333-6833852

ای میل: hamidsiraj@hotmail.com

hamid42221@yahoo.com

ISBN:978-969-8917-74-6

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

انتساب

پروفیسر محمد فیروز شاہ (مرحوم)

کے نام

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

جان کر منجملہ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

جس روز میں
لکھنا چھوڑ دوں گا

اس روز میں مرجاؤں گا

محمد حامد سراج

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

فہرست

گاؤں کا غیر ضروری آدمی	۷
عادت ہی بنالی	۱۱
کلوننگ کی پیداوار	۲۱
خواب میں پیوست کانٹا	۲۵
برائے فروخت	۳۱
بہت دیر کردی	۳۸
چائے کی پیالی	۴۴
دہاڑی	۵۱
بے خوار	۵۴
جرابوں کی تدفین	۵۸
تسبیح کے دانے	۶۵
گھڑی، سمت، سوئیاں	۷۶

ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

آخر آئس کیوب	۸۴
کتنے مہر دین	۹۹
راوی خاموش ہے	۱۰۸
جھونکا ہوا کا	۱۱۶
رونے کی آواز	۱۲۸
کھلن کو مانگے چاند	۱۳۴
کیڑا	۱۳۸
کتاباں	۱۴۹
موم بتی اور دیا سلائی	۱۵۵

گاؤں کا غیر ضروری آدمی

زمین پر سورج کتنے قرنوں سے طلوع اور غروب کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یہ اندازہ تخمینہ لگنا ممکن ہی نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے محور میں گھوم رہے ہیں۔ چاند، ستارے، سورج، زمین، انسان، چرند پرند اور دکھ سکھ۔۔۔۔۔سب گھوم رہے ہیں۔

اپنے اپنے حصے کی عمریں پوری کر رہے ہیں۔

وہ بھی ایک ایسی ہی صبح تھی۔

میں مسجد کے صحن میں بیٹھا کھلتی صبح کے اوراق گن رہا تھا۔

ایک شخص جس نے میلی سی پگڑی باندھ رکھی تھی، میرے پاس آ کر بیٹھا اور دھیرے سے کہا۔

جی وہ خیرو لوہار مر گیا ہے۔ اس کے مرنے کا اسپیکر پر اعلان کر دیں۔ اس کے چہرے پر دکھ کا کوئی پرتو نہیں تھا۔

کیا کہا۔۔۔۔؟

خیرو لوہار مر گیا۔۔۔۔! کل تک تو وہ بھلا چنگا تھا۔

کھلتی صبح کے اوراق بے ترتیب ہو گئے۔ مسجد کے گنبدوں سے نکلنے والا ایک سا اعلان ۔۔۔۔ ''حضرات، ایک ضروری اعلان سنیں۔ خیر محمد لوہار قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے۔ اس کی نمازِ جنازہ دن کے گیارہ بجے عید گاہ میں ادا کی جائے گی۔''

اس کا پورا نام شاید زندگی میں دوسری بار لیا گیا تھا۔ پہلی بار جب اس کے ماں باپ نے رکھا ہوگا اور اب دوسری بار اس کی موت پر۔ فضا میں چپ سی گھل گئی۔

میں یقین اور بے یقینی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے مسجد سے باہر آیا تو سامنے کے احاطے سے صدو بھینسوں کی پیٹھ تھپکتا باہر نکل رہا تھا۔

اس کے چہرے پر صرف کام کی تھکن تھی۔ اسے ساتھ لے کر جب میں خیرو کے گھر ٹوٹی لکڑیوں کے ادھ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو کچے کمرے کے سامنے کچے صحن میں ایک چار پائی پر خیرو ابدی نیند سو رہا تھا۔ اس پر اس کے کردار کی طرح سفید چادر تھی۔

بے داغ، اجلی اجلی، دھلی دھلی ۔۔۔۔۔ وہ مجھے ہمیشہ میلے کپڑوں میں نظر آیا۔ اس کے مکمل نام کی طرح میں نے پہلی بار اسے اجلی چادر میں دیکھا۔

دری پر دو عورتیں اپنے سامنے رکھی چائے کی کیتلی میں سے کم دودھ والی چائے پیالیوں میں ڈال رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں اور چائے کا رنگ ایک جیسا تھا۔ نیم کے درخت تلے اکیلی چار پائی پر اس کا نیم پاگل بیٹا اپنی داڑھی کھجا رہا تھا۔ لوہے کے اوزار خاموش تھے۔ چھوٹی سی بھٹی جس میں کوئلے اس کے سینے میں دبے ارمانوں کی طرح دہکا کرتے تھے اور اس میں دھواں اس کے سانس کی طرح آہیں بھرتا نکلتا تھا۔ آج خیرو کا سینہ اور بھٹی دونوں خاموش تھے۔

جتنی تیزی سے بستی کے اسپیکروں پر اس کی موت کا اعلان ہوا اتنی تیزی سے ایک بھی شخص اس کے گھر نہ پہنچا۔ اس کی ایک بیٹی کو دور میں نے کھیتوں میں باپ کے سائے کے بجائے شیشم کے سائے تلے کھڑا دیکھا۔ وہ اکیلی کھڑی رو رہی تھی۔ اس کے سر پر پھٹا دوپٹہ اور پاؤں میں ٹوٹی چپل تھی۔ نو بجے جب کفن پہنچا تو اس وقت دو کی بجائے چار عورتیں بیٹھی تھیں۔ کوئی ہوک، کوئی کوک نہ تھی۔ عجب سناٹا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔

موت کے قدموں کی چاپ سننے میں باہر نکلا۔ زندگی معمول پر تھی۔ کسی نے بھی اس کی موت کا نوٹس نہ لیا۔ کسی زبان پر اسکا تذکرہ نہ تھا۔ ابھری ہڈیوں، دھنسے گالوں، بڑھی شیو اور کرخت ہاتھوں والا خیرو لوہار گاؤں والوں کے درمیان نہ تھا۔ غربت نے اس کا لہو چوس کر ہڈیوں پر صرف چمڑہ رہنے دیا تھا۔ اس کی ہڈیاں اس کی مفلسی کی طرح نمایاں تھیں۔ اس کی صحت گرتی رہی۔ سنا ہے اسے یرقان تھا۔ اسے کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔ زمین نے جب زندہ

انسانوں کی بے حسی دیکھی تو اسے اپنی آغوش میں سلا لیا۔ وہ خوش قسمت تھا اسے جمعہ کا دن نصیب ہو گیا۔

میں سوچنے لگا اس کی تاریخِ وفات کون نکالے گا۔۔۔۔۔؟ اس پر کس اخبار کا ایڈیشن اور کس رسالے کا نمبر نکلے گا۔۔۔۔۔؟ غریب کے جنازے پر کس کا انتظار ہوتا ہے۔ میں پونے گیارہ بجے وضو کر کے گھر سے نکلا تو جنازہ عید گاہ جا چکا تھا۔ وہاں پہنچا تو صفیں ترتیب پا رہی تھیں۔ شریہہ کے درختوں تلے لوگ اپنی اپنی باتوں اور مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ گندم کی بالیاں پک چکی تھیں۔ جنازے پر خاموشی کی بجائے گندم کی کٹائی سے لے کر تھریشر تک کے معاملات زیرِ بحث تھے۔ علاقے میں ہونے والی گھوڑوں کی دوڑ بھی موضوعِ سخن تھی۔۔۔۔۔ کون جیتا، کون ہارا۔۔۔۔۔؟ امام صاحب نمازِ جنازہ پڑھانے کا طریقہ بتا رہے تھے۔۔۔۔۔ نماز جنازہ۔۔۔۔۔ فرض کفایہ۔۔۔۔۔ چار تکبیریں۔۔۔۔۔ ثناء واسطے اللہ تعالیٰ کے، درود واسطے حضرت محمد ﷺ کے۔۔۔۔۔ دعا واسطے حاضر میت کے۔۔۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔۔۔ بھنبھناتے لوگوں کی دو صفوں کو توڑ کر طاق کیا گیا۔

صفیں ٹوٹنے کے بعد جب جنازہ کندھوں پر اپنی منزل کو چلا گیا تو لوگ چند قدم اس کے ساتھ چلے۔ پھر اپنے اپنے گھروں کو مڑ گئے۔ نہر کے کنارے شیشم کے درختوں کے نیچے اس کا جنازہ جا رہا تھا۔ چارپائی اٹھانے والوں کے علاوہ پانچ سات آدمی ساتھ تھے کہ اسے دفن کرنا ضروری تھا، وگرنہ شاید وہ بھی لوٹ آتے۔

میں ایک دکان پر رک گیا۔ کچھ لوگ اکٹھے تھے۔ میں نے سوچا، یقینی طور پر خیرو لوہار کی باتیں ہو رہی ہوں گی۔ لیکن وہ تو اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ تھوڑا آگے گیا تو خیرو کا ہمسایہ آرے پر بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا۔ دو قدم جنازہ گاہ تک نہ جا سکا۔ اگلی صبح بستی کے منیاری کے کھوکھوں، گوشت کی دکان، راہوں اور بیٹھکوں کے قریب میں نے لوگوں سے اس کا تذکرہ کیا۔

طیفے مرغی والے سے جا کر میں نے پوچھا۔

یار طیفے۔۔۔۔۔ خیرو کا بڑا گہرا دکھ ہے۔

جی جی۔۔۔۔۔ اس نے مرغی کی کھال کھینچتے ہوئے کہا۔

اسلم نائی سے بات کرنی ویسے ہی فضول تھی۔ اس کی دکان میں لگے دیسی ڈیک سے

علاقائی گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز پورے زور سے گونج رہی تھی۔۔۔۔۔

"قمیض تیڈی کالی۔۔۔۔۔۔ تے سوہنڑے پھلاں والی"

وہ موسیقی کی دھن پر ایک آدمی کی شیو بنا رہا تھا۔ سائیکلوں کی دکان پر بیٹھا سفید ریش شخص پنکچر لگا رہا تھا۔ دوسا کھوکھے والا قریبی شہر سے سائیکل پر تازہ سبزی اور سودا سلف لا رہا تھا۔ آرائیوں والی ہٹی پر حسبِ معمول رش تھا۔ بشیر آرائیں اپنے ستے ہوئے چہرے سمیت ماتھے پر بل ڈالے گاہکوں کو بھگتا رہا تھا۔ بستی کی نکی پر چائے کے دو چھپر ہوٹل تھے۔ وہاں دو ٹریکٹر کھڑے تھے۔ مزدور ٹھٹھہ مخول کرتے چائے پی رہے تھے۔

تو کیا کسی کو بھی خیرو کی موت کا دکھ نہیں ہے۔

کوئی تو ان کو خبر کرے۔

لوگو۔۔۔۔۔ خیرو لوہار مر گیا۔

ہم میں سے ایک انسان کم ہو گیا۔

وہ علاقے کا نہ سہی گھر کا تو سربراہ تھا۔

کل تک گاؤں کی پگڈنڈیوں پر اپنا گدھا ہانکتا، میلے دانتوں میں اجلی مسکراہٹ لیے سر ہلاتا، دوہڑے الاپتا وہ شخص کہاں گیا۔۔۔۔۔؟

وہ تو تمھارے ہر دکھ میں رہا۔ تم لوگ اس سے اپنی درانتیاں تیز کراتے تھے، ہلوں کے پھالے، ترینگل اور کھرپیاں بنواتے تھے۔ گم چابیوں والے تالے تڑوایا کرتے تھے۔ تمھاری آنکھیں کیوں عقیدتِ غم سے خالی ہیں۔

خیرو کی رسمِ قل اس کے مرنے کے بتیس گھنٹے بعد ادا کر دی گئی۔

گلی کے موڑ پر بچھی چارپائی پر اس کا اداس بھائی، بیٹا فیضو اور ایک ریٹائرڈ سپاہی رہ گئے۔

سڑک پر سے گزرنے والے سائیکل سوار اور تانگے والے گردن موڑ کر ایک نظر دیکھ لیتے۔ کوئی اکّا دُکّا فاتحہ خوانی کے لیے رک جاتا۔

اچانک۔۔۔۔۔

ایک بے حس آواز کے بے جان پتھر نے ان کے درمیان رکھے خاموشی کے برتن کو کرچی کرچی کر دیا۔

فیضو کے سامنے درانتیاں اور ٹوکے رکھے تھے۔

☆☆☆

عادت ہی بنالی

فضا میں گرد ٹھہر گئی تھی۔ کویت میں آندھیاں کچھ اس انداز میں چلتی تھیں کہ کئی کئی روز فضا گرد آلود رہتی اور بڑی بڑی شاہراہوں پر قیمتی گاڑیاں یوں محسوس ہوتیں جیسے سمندر میں مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ پچھلے کئی روز سے طبیعت اداس اور تھکی تھکی سی تھی۔ یونہی بے مقصد شاہراہوں پر گھومنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ اس روز بھی میں اپنے کاندھے پر ناکامیوں کی گٹھڑی اٹھائے بے روزگاری کا طوق لیے کویت شہر جانکلا۔ سامنے سوق وطنیہ تھی۔ اس مارکیٹ میں زیادہ تر پاکستانی، بنگلہ دیشی، سری لنکن، کورین وغیرہ خریداری کرتے نظر آتے ہیں۔ میریڈن ہوٹل سے گزر کر میں دائیں طرف مڑ گیا۔ کاروں کے بہتے سیلاب میں ایک لبنانی لڑکی سڑک کراس کررہی تھی۔ اس کی شرٹ کا گریبان ادھ کھلا، جین کی چست پینٹ اور کندھے پر کالا بیگ جھول رہا تھا۔ سڑک کی دوسری سمت چند کورین دن بھر کی مزدوری کے بعد تھکے قدموں سے پیلے ہیلمٹ ہاتھوں میں جھلاتے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ کویت میں مارکیٹیں کئی منزلہ ہیں اور اس میں سینکڑوں دکانیں ہیں۔ میں نے دیکھا، بیشتر دکانیں بند تھیں۔ اکا دکا کھلی تھیں۔ معاً میرے کانوں میں موسیقی کی مدھر تانیں رس گھولنے لگیں۔ غلام علی کی آواز دیارِ غیر میں اپنی طرف کھینچنے لگی۔ دیارِ غیر میں خاک چھانتے ہوئے ایک عرصہ ہو چلا تھا۔ بے روزگاری تھی کہ ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔ فقط موسیقی ہی ایک ایسا شوق تھا جسے قائم رکھ سکا تھا کہ اچھی غزلیں اور گیت میری کمزوری تھے۔ میں

نے دیکھا، بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی دکان سے مشرقی موسیقی کے میٹھے اور مترنم سُر بے اختیار وطنِ عزیز کی یاد دلا رہے تھے۔ دیارِ غیر میں غلام علی کی آواز میں مٹی کی خوشبو جادو بن کے ہر سوُ بکھر رہی تھی۔ میں دکان میں داخل ہوا۔ سامنے کاؤنٹر پر باریک نقوش، صاف رنگت اور کندھوں تک بکھرے بالوں میں ملائم چہرہ لیے ایک لڑکی نے اپنی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ اس کے چہرے اور مسکراہٹ دونوں میں جانے کیا کشش تھی کہ دیکھتا رہ گیا۔ تادیر مجھے اندازہ نہ ہو پایا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہے۔ اتنا عرصہ رہتے ہوئے، بازاروں میں گھومتے، خاک چھانتے اجنبی چہرے پڑھتے، چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ سری لنکن ہے، بنگلہ دیشی ہے، فلپائنی ہے، مصری یا لبنانی ہے۔ میں ابھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا تھا کہ اس نے اردو میں حملہ کر دیا۔ کیوں کہ اس کا مشاہدہ مجھ سے تیز نکلا!

کون سی موسیقی چاہیئے۔۔۔۔۔؟

''اپنے ملک پاکستان کی'' میں نے جواباً کہا۔

''وہ ہے بہت۔ پاس ہمارے۔ نام بولو'' اسے اردو بولنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

آپ انگریزی بول لیتی ہیں؟ میں نے پوچھا۔

"Yes" اس کی آنکھیں بے اختیار چمک اٹھیں۔

اور پھر تو میرے کہنے پر اس نے کاؤنٹر پر مہدی حسن، غلام علی، پرویز مہدی، استاد امانت علی خان، نور جہاں اور منی بیگم کی کیسٹوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ میں کافی دیر اس کے ہاتھوں میں کھلتی، بند ہوتی کیسٹیں کم اور انگلیاں زیادہ دیکھتا رہا۔ شاعری کے در وا ہونے لگے تھے۔ میں نے استاد امانت علی خان اور پرویز مہدی کے دو کیسٹ پسند کئے اور ادائیگی کر کے باہر نکل آیا۔

اندھیرا ہوتے ہی باہر روشنیوں کا سیلاب بہہ نکلا تھا جس میں کاریں بسیں انسان بہہ رہے تھے اور انسانوں کے اندر سوچیں رینگ رہی تھیں۔ ہر آدمی اپنی سوچ کے سمندر میں غرقاب چل رہا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا بس وہی جانتا تھا۔ یہی سوچیں ہی تو انسان کا اصل سرمایہ اور وفادار ساتھی ہیں جو کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتیں، چاہے آپ انھیں لاکھ دھتکاریں اور فرار ہونے کی کوشش کریں۔

ہم روزانہ کتنے چہرے دیکھتے ہیں۔ ہر انسان میں ایک دنیا بند ہوتی ہے۔ ہم انسانوں کو

پڑھنے کا فن جان لیں تو کتنے لوگ اپنا دکھ ہماری جھولی میں ڈال کے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کریں،لیکن زرداری کے اندھے دور میں کسی کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ کسی کی پوری کتھا سنے۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ میں اپنی مصروفیات میں کھویا رہا اور کویت شہر جانا نہیں ہوا۔بعض اوقات ہمارا کہیں جانے کا ارادہ نہیں ہوتا اور کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔میں بھی ایک روز اچانک کسی کام سے جانکلا اور پھر اسی مارکیٹ سے گزرتے ہوئے وطن کی خوشبو مہدی حسن کی آواز میں بکھر کر فضا کو معطر کر رہی تھی۔

گو بہ گو پھیل گئی بات شناسائی کی

اور میرے قدم خود بخود اس دکان کی طرف اٹھ گئے جہاں کندھوں تک بکھرے بالوں میں ملائم چہرہ لیے ایک لڑکی اپنی لانبی لانبی انگلیوں سے کیسٹیں کھول کھول کر گاہکوں کو دکھا رہی تھی۔ میں اسے سلام کر کے سٹول پر بیٹھ گیا۔اس نے پھر میرے سامنے کیسٹیں ڈھیر کر دیں۔

آپ ٹھنڈا پیئیں گے یا گرم۔۔۔۔۔؟اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

دونوں۔۔۔۔۔

وہ میرا جواب سن کر ہنس پڑی۔ اس نے پہلے ''شانی'' کے ٹن پیک منگوائے اور پھر چائے۔ چائے کی چسکیوں کے دوران دونوں جانب سے باتیں دلوں میں اترنے لگیں۔ باتیں تھیں کہ بکھرتے موتی۔ وہ رولتی رہی میں چنتا رہا۔میں نے پوچھا۔

آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟میں اپنے تجسّس کو نہ چھپا سکا۔

سری لنکا سے۔

اور آپ کا خوب صورت نام؟

جی فاطمہ۔

تو آپ مسلمان ہیں؟ میں نے نام سے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

الحمدللہ۔اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔

کویت آئے کتنا عرصہ ہوا ہے۔ میں نے گفتگو جاری رکھی۔

چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ وہ بولی۔

اس دکان پر کب سے ہیں؟ میں نے مزید معلومات چاہی۔

قریباً دو ماہ ہو گئے ہیں۔اس کے بعد تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

آپ پاکستان کے کس شہر میں رہتے ہیں؟ اس نے میری پیالی میں دوبارہ چائے ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

فاطمہ، جب ہم اپنی سرزمین چھوڑ کر اجنبی راہوں پہ چلتے کسی اور سرزمین میں جا اترتے ہیں تو ملکوں کے شہر اپنی پہچان کھو بیٹھتے ہیں۔ وہاں صرف ملکوں کے نام سے پہچان ہوتی ہے۔کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ میں پاکستانی ہوں، تم سری لنکن اور بے روزگاری نے ہمیں ایک اجنبی سرزمین پر اتفاقاً یونہی راہ چلتے ملا دیا ہے اور کل کو ہم پھر بچھڑ کے اپنی اپنی مٹی سے رشتہ جوڑ لیں گے اور تنہا لمحوں میں یادیں موتی بن کے چمکیں گی جیسے آج تمھارے دانت چمک رہے ہیں۔

میں باتیں خوبصورت نہیں کرتا بلکہ حسن سامنے ہو تو شاعری کہیں سے اتر کر خود بخود لفظوں کی لڑیاں پرونے لگتی ہے۔

اور چائے منگواؤں۔۔۔۔۔؟ وہ خلوص سے بولی۔

نہیں شکریہ، پھر سہی۔۔۔۔۔! میں نے بھی اسی اخلاص سے جواب دیا۔

آپ آتے رہا کریں۔۔۔۔۔نہ جانے اس نے کس جذبے کے تحت کہا تھا۔

وعدہ نہیں کرتا مگر کوشش کرتا رہوں گا۔میں نے ذمہ داری سیکھا۔

دکان سے نکلنے لگا تو اس نے آواز دے واپس بلایا۔

ایک بات کہوں؟ وہ رازداری سے بولی۔

کہیں۔۔۔۔۔مجھے تجسّس ہوا۔

آپ دس کیسٹ کا ایک ڈبہ لے یہاں میرے پاس رکھ جائیں۔جب بھی پاکستان سے کوئی نئی غزلوں کی کیسٹ آئے گی میں آپ کے لیے ریکارڈ کر دیا کروں گی اور ایک شرط ہے۔

وہ کیا؟

میں ریکارڈنگ کے پیسے نہیں لوں گی۔وہ مسکرا کے بولی۔

دیکھیں گے۔۔۔۔۔اور میں اسے خدا حافظ کہہ کر روشنیوں کے سیلاب میں اتر گیا۔ پھر وہی ہم تھے اور غمِ روزگار، شاہراہوں پر سائن بورڈ پڑھتے، نوکری تلاش کرتے، دھوپ چھاؤں میں جلتے دن گزرتے رہے۔

میں بھول گیا کہ کسی کے نرم ہاتھوں میں گرم وعدہ دے آیا تھا اور اس کے ہاتھ انتظار کی حدت سے سلگ رہے ہوں گے۔ ایک روز بستر پر لیٹا وطن کی یادوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک فاطمہ کا خیال آیا اور میں بس نمبر 502 پر جہراء چل نکلا۔

وہاں پہنچا تو وہ گاہکوں میں گھری موسیقی کی باتوں میں نہا رہی تھی۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ اس کے حسن کے سُر بھی دکان کو بقعۂ نور بنا رہے تھے، مہک رہے تھے، چمک رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائی اور گاہکوں میں مصروف ہوگئی۔ میں مسلسل اس کی مسکراہٹ کی نرم حدت اپنی ہتھیلی، پلکوں، آنکھوں اور ہونٹوں پر محسوس کرتا رہا۔ کیسٹوں کے درمیان گھری زندہ کیسٹ کو دیکھتا رہا۔ جسے میں سننا چاہتا تھا، اس کے تار چھیڑنا چاہتا تھا، لمس سے موسیقی کی سوئی ہوئی لہریں جگانا چاہتا تھا اور جب بھیڑ چھٹ گئی تو اس کی موسیقی کی لہریں میرے بدن میں اترنے لگیں۔

اتنے دن آئے کیوں نہیں؟ اس نے مصنوعی ناراضگی ظاہر کی۔

کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بے روزگاری، تلاشِ معاش، آوارہ گردی۔ کسی کے گھر گیا تھا۔۔۔۔

بے روزگاری کے گھر رہا اتنے دنوں۔

میں سمجھی نہیں۔

بس نہ سمجھو تو اچھا ہے۔ تم میرے ساتھ اچھی اچھی باتیں کیا کرو۔

موسیقی سنایا کرو۔

چائے آگئی۔۔۔۔۔ چائے میں بھی جادو ہوتا ہے۔ اس میں سے اٹھتی بھاپ کے ساتھ ساتھ دل سے باتوں کی خوشبو اٹھنے لگتی ہے۔ وہ چائے پیتی رہی، مجھے اپنے گھر کے بارے میں بتاتی رہی۔۔۔۔۔ کہ ہم پانچ بہنیں ہیں دو بھائی۔ دونوں باپ کا بازو کیا بنتے غلط راہوں پہ چل کے نشہ کی لعنت میں گرفتار ہو کر وہ کہیں کے نہ رہے۔۔۔۔۔ سارا دن آوارہ گردی کر کے شام ڈھلے جب گھر لوٹتے تو بھونچال سا آ جاتا۔ لڑائی جھگڑا، غربت، گالی گلوچ، میرے ابو ایک سرکاری محکمے میں کلرک تھے۔ اتنی تنخواہ نہ تھی کہ گھر کا کھلا خرچ چل سکے۔ اوپر سے آئے دن گھر کے جھگڑے، بیٹوں کی نافرمانی اور خودسری۔۔۔۔۔ دو دونوں بازو تھے۔ جب بازو بے کار ہو گئے تو بوڑھا باپ کہاں تک اپنی زندہ لاش گھسیٹتا۔ پچھلے برس وہ خون تھوکتے تھوکتے دونوں بھائیوں کا

دکھ اور ہم پانچ بہنوں کے مستقبل کے خواب دیکھتا ایک روز خاموشی سے اس سفر پر جا نکلا جہاں سے آج تک کوئی نہیں لوٹا۔ کیا عجیب سفر ہے۔ معلوم سے نامعلوم کا سفر۔۔۔۔۔ وہ ایک دم دکھی ہوگئی۔

اس کی سمندر ایسی آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے اور اس کی لہریں کبھی کبھی جوار بھاٹا بن کر باہر آنے لگیں۔ میں اس کے دکھوں کی آنچ سے پگھلنے لگا۔ آنچ اتنی تیز تھی کہ میں اپنے اور اس کے آنسو ملا کر بھی اسے دھیما نہ کر سکا۔ حرفِ تسلی کوئی مرہم تو نہ تھے میں اس کے نام کر دیتا۔ میں سوچتا رہا کہ اس کے چہرے پر بیٹھی اداسی اور آنکھوں میں دکھ کی کروٹ لیتے آنسوؤں کے ہاتھوں صرف تسلی تھما کر لوٹ چلوں، مگر میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور میرے آنسو ساری باتیں کہہ گئے۔ آنسو زبان بن کے وہ سب کچھ کہہ گئے جو میں خود نہ کہہ سکا۔

تم میری زندگی میں پہلے شخص ہو جس کی آنکھوں میں میں نے اپنے لیے آنسو دیکھے ہیں۔ میں انھیں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔

میرے ہونٹوں کے درمیان بیٹھی چپ اس کا منہ تکتی رہی۔ اٹھنے لگا تو اچانک کاؤنٹر کے پیچھے میری نظر گئی اور میں نے حیران ہو کر اس سے سوال کیا۔

یہ سب کیا ہے۔۔۔۔۔؟

میں سمجھی نہیں۔

یہ جو ایک قطار میں ''شانی''، سیون اپ، پیپسی رکھی ہیں اور آئس کریم کی بند ڈبیاں۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔۔۔؟

اوہ۔۔۔۔۔ اس کے ہونٹ سکڑ کر کچھ اور خوب صورت ہو گئے۔

تم جتنے دن نہیں آئے، تمھاری یاد میں جب بھی کوئی چیز پیتی، ایک اپنے لیے اور دوسری تمھارے لیے منگواتی۔ تم انہیں گن کر اندازہ کر لو کہ جدائی میں کتنے دن گزر گئے۔۔۔۔۔

وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ پھر خاموشی سے باتیں کرنے لگی۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ میں کبھی اس کے چہرے پر لکھی تحریر اور کبھی ان بند ڈبوں کی طرف دیکھتا جن میں اس کی خاموش، بے زبان محبت بند تھی۔ میں دکان سے نکلا تو آوازیں میری پیچھا کر رہی تھیں۔ صدائیں پکار رہی تھیں۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور راستے کاٹنے لگا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس سامنے

وہ تھی، اس کے جذبے، اس کی باتیں، اس کا خلوص، شانی، سیون اپ، پیپسی کے ٹن اور آئس کریم کی ڈبیاں! اس نے یہ کیا روگ پال لیا ہے۔ میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ میں مسافر، وہ بھی مسافر، جب راستے جدا، منزلیں جدا تو پھر اتنے قریب آ کر بچھڑنے سے بہتر ہے کہ ریلوے لائنوں کی طرح دو متوازی فاصلے پر چلتے رہیں۔ مجھے وہ صبح یاد آ گئی جب ایک دفعہ اس کے پاس بیٹھا سینڈوچ کھا رہا تھا۔ میرے چہرے پر سطر سطر اداسی پڑھ کر اس نے پوچھا تھا۔

آپ چپ کیوں ہیں۔۔۔۔۔؟

کچھ تو ہے، وہ اڑی رہی، تو میں پگھل گیا۔

ہاں ہے۔۔۔۔۔ دکھ ہیں، غم ہیں، آنسو ہیں، بے روزگاری ہے، اندھی گونگی سوچیں ہیں جو میرے مستقبل کی کمزور دیواروں سے سر پٹختی رہتی ہیں۔ ہم جیسے تلاشِ معاش میں بھٹکتے لوگوں کی سوچیں اتنی طاقتور نہیں ہوتیں کہ زندگی کا رخ بدل جائے۔ سوچیں بس سوچیں ہوتی ہیں۔ منفی اور مثبت، آوارہ ہوتی ہیں، ذہن کی بھٹی میں کوئلوں کی طرح سلگتی رہتی ہیں اور راکھ بن جاتی ہیں۔ یہ کھوکھلی ہوتی ہیں۔ یہ روٹی نہیں دے سکتیں۔ بھوک ختم نہیں کر سکتیں۔ یہ سینے کا سرطان ہوتی ہیں۔ لاعلاج ہوتی ہیں۔ گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔ میں بولتا رہا، اچانک سر اٹھا کر دیکھا تو میرے سارے دکھ اس کے دل سے گزرے روح کے تار جھنجوڑتے آنکھوں سے ہوتے میری ہتھیلی پر سلگ رہے تھے۔ مجھے آج بھی اپنی ہتھیلی پر ان آنسوؤں کی جلن محسوس ہوتی ہے۔

آپ رویا نہ کریں۔ وہ بڑے پیار سے کہہ رہی تھی۔

رو تو آپ رہی ہیں۔ میں نے چونک کر کہا۔ اتنے میں جگجیت سنگھ کہنے لگا:

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں بسا لے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو

گاہکوں سے فارغ ہو کر مجھ سے دنیا جہاں کی باتیں پوچھتی۔ پاکستان کے لوگوں اور ان کے کلچر، تہذیب و تمدن کے بارے، لوگوں کے طرزِ رہائش، شہروں اور گاؤں کے بارے اور ہم دونوں یوں گھنٹوں باتیں کرتے جیسے جنم جنم سے شناسائی ہے۔ اتنے کم وقت میں اتنی قربت مجھے خائف رکھنے لگی۔ مجھے اس کی عادت ہوتی جا رہی تھی۔ جانے کہاں سے دکھ کا زہریلا بچھو میرے اندر آ کر ٹھہر گیا اور مجھے ڈسنے لگا کہ یہ تم سے بہت جلد بچھڑ جائے گی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ

اس بچھو کو مار سکتا۔ بچھڑنے سے پہلے میرے اندر جدائی کا زہر سرایت کر گیا۔ میں نے اس سے بعد میں کبھی دکھ کی بات نہ کی۔ جس روز سے میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے آنسو دیکھے تھے۔ وہ مجھے غزلیں ریکارڈ کر کے دیتی رہی۔ یادیں بن بن پہناتی رہی۔ شاید وہ بھی تھوڑے دنوں میں اپنے دل کے آنگن میں اتنی یادیں اگا لینا چاہتی تھی، ساری زندگی جن کی مہک اس کے جینے کا سامان کرتی رہیں۔

اور پھر ایک روز جب میں اس دکان میں داخل ہوا، دکھ کے بچھو نے سارا زہر یک مشت میرے اندر اتار دیا۔ سامنے کاؤنٹر پر دو نوجوان کھڑے تھے، گہرے سانولے، شیو بڑھی ہوئی، گلے میں سونے کے لاکٹ، بال بے ترتیب، آنکھوں میں وحشت اور عریانی جب کہ فاطمہ کے چہرے پر پریشانی اس کا کرب سناتی نظر آ رہی تھی۔ دونوں میں سے ایک بولا تم آج رات ہمارا انتظار کرو گی۔ کس جگہ؟ وہ وحشت زدہ تھی۔

رات دس بجے ۔۔۔۔۔ اسی دکان میں ۔۔۔۔۔ ہم آئیں گے اور تمھیں لے جائیں گے۔ اب تم ہمارے پاس رہو گی۔ وہ فیصلہ سنا رہا تھا۔

مگر جہاں میں رہتی ہوں وہاں میرا سامان ۔۔۔۔۔؟ اس نے احتجاج کیا۔ تمھارا سامان ہم نے اٹھا لیا ہے۔ سودا طے ہو گیا ہے۔

وہ دونوں دکان سے نکلے تو میرے سامنے ایک بوکھلائی ہوئی بے بس لڑکی کھڑی تھی۔ جس کی چار اور بہنیں تھیں، دو لفر بھائی اور ایک بوڑھی ماں، جس کا باپ اسے وقت سے پہلے دکھوں کے جنگل میں تنہا چھوڑ گیا تھا اور یہاں جسم کے سوداگر اس کی بولیاں لگاتے پھر رہے تھے۔ اسے تھوڑے دنوں میں زیادہ پیسہ کما کر اپنے گھر بھیجنا تھا تاکہ اس کی بہنوں کے ہاتھ پیلے ہو سکیں، اس کے لوفر بھائیوں کو نشہ کے لیے روپیہ ملتا رہے۔ بوڑھی ماں کی آنکھوں کا آپریشن ہو سکے اور وہ بکتی رہے۔ اس کے مسائل میرے سامنے تھے۔

کون تھے یہ لوگ؟ میں نے پوچھا۔

تعلق تو ان کا بھی سری لنکا سے ہے۔ انھیں اپنی رہایش پر بس میں نے ایک بار دیکھا تھا۔ دونوں کہیں ڈرائیور ہیں۔ مجھے جو شخص یہاں لایا ہے، مجھے جی بھر کے لوٹنے کے بعد کئی دن سے غائب ہے۔ اس دکان پر مجھے اس نے ملازم کرایا تھا۔ کہتا تھا کسی عربی کی دکان ہے۔ اب پتا لگا کہ

وہ مکار مجھ سے جھوٹ بولتا رہا۔ یہ دکان کسی اور نے کرائے پر لے رکھی ہے اور یہ دو جو آئے تھے اس کے پارٹنر ہیں۔ پہلے اس کے پاس لٹتی رہی، اب ان کے پاس لٹتی رہوں گی۔ پھر خود شکار تلاش کر کے لوٹتی رہوں گی۔ اس کا نیا روپ میرے سامنے تھا لیکن وہ سارے معاملے میں بے قصور تھی۔

تمھیں گھن نہیں آتی؟ میں نے کریدا۔

پہلے پہلے آتی تھی، اب نہیں آتی۔ میرے دوست بتاؤ تم کبھی اپنے پاکستان میں بھوکے سوئے ہو؟ اس نے الٹا سوال داغ دیا۔ نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

تو پھر تم میری بات نہیں سمجھ سکو گے۔ میں سمجھانا بھی چاہوں تو تمھیں سمجھ نہ آئے گی۔ کیوں کہ تم کبھی بھوکے نہیں سوئے۔ تمھارے گھر کبھی چولہا سرد نہیں ہوا۔ میرے اندر گناہ وثواب کی تمیز خودکشی کر گئی ہے۔ میں عرصہ ہوا گناہ وثواب کی لاش دفن کر چکی ہوں۔ میرے پاس جوانی ہے، انگڑائیاں لیتا بھرپور بدن ہے، اس میں رس ہے، مٹھاس ہے، کشش ہے، اسے استعمال کروں گی، اس کا رس بیچوں گی، مٹھاس بیچوں گی۔ اس طرح میری بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی۔ ماں کی بینائی لوٹ آئے گی۔ گھر میں چولہا جلتا رہے گا۔ میں نے اپنے جسم کو بچا کے کیا کرنا ہے؟ میرے ایک جسم کے بکنے سے اگر بہت سے لوگوں کی آنکھوں کے دیپ جلتے رہیں تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ اجنبی تم اس پردیس میں واحد شخص ہو جس کی آنکھوں میں میں نے ہوس نہیں دیکھی۔ تم نے میرے جسم کی طرف نہ بڑھ کر میری نگاہوں میں اپنا قد بہت اونچا کر لیا ہے۔ میں تمھیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ یاد رہے گا کہ بھیڑیوں کے درمیان ایک انسان بھی ملا تھا۔

اس نے چائے منگوائی۔ چائے تھی، بسکٹ، باتیں تھیں، اداسی تھی، بے چینی تھی، بے قراری تھی، دکھ اور کرب تھا، الجھتے سلجھتے لمحے تھے۔ وقت کا لامتناہی صحرا سامنے تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان چند لمحوں میں ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونا تھا۔ بھیڑیوں کی اس بھیڑ میں اس نے لقمے تلاش کرنے تھے اور مجھے جنگل میں اپنا رستہ تلاش کرنا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، سوچ رہے تھے۔ اس نے دس کیسٹوں کا ایک پیکٹ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

یہ ہمیشہ تمھیں میری یاد دلاتا رہے گا۔ یہ میں نے بڑی محبت اور محنت سے تمہارے لیے

ریکارڈ کی ہیں۔ مجھے خبر نہیں محبت کیا ہوتی ہے لیکن اجنبی میں نے تمھیں اپنے دل کے قریب محسوس کیا ہے۔ اگر رات گئے اچانک آنکھ کھلنے پر کسی کی یاد بے ساختہ دستک کا نام محبت ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اگر روشنیوں کے شہر میں انسانوں کے درمیان گزرتے ہوئے اچانک چونک جانے کا نام محبت ہے تو مجھے تم سے محبت ہے۔ اجنبی کسی کی یاد میں آنکھیں موتی پرونے لگیں اور ہتھیلیاں سلگنے لگیں تو اسے کیا کہتے ہیں؟ میں نے تمھیں ہر لمحے محسوس کیا ہے۔ شاید اجنبی تم اپنے پاکستان جا کر مجھے بھول جاؤ۔۔۔۔ وہ شدتِ جذبات میں سب کچھ کہہ گئی۔

فاطمہ۔۔۔۔۔ میں یقیناً تمھیں زندگی کے ہنگاموں میں الجھ کر بھول جاتا مگر ایک یاد ایسی چھوڑے جا رہی ہو جو مجھے ہر موسم میں بے چین رکھے گی۔ میرے دل میں ہجر کا موسم ہمیشہ ہرا بھرا رہے گا۔ فاطمہ ایک روز تم میرے دکھ پر روئی تھیں اور میری ہتھیلی پر تمھارے آنسوؤں کی جلن تھی۔ یہ جلن مجھے ساری زندگی بے چین رکھے گی۔ شاید تمھاری ہر بات، ہر ادا بھول جائے، لیکن سلگتے ہوئے آنسوؤں کی جلن بھولنا میرے بس کی بات نہ ہوگی۔

باہر چندھیا دینے والی روشنیاں تھیں اور دکان کے اندر کی تیرگی اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ فاطمہ کی زبان چپ تھی اور گالوں پر دو آنسو مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔

اجنبی، میرے گالوں پہ تمھارے نام کے ان دو آنسوؤں کی جلن مجھے بھی ہر رت، ہر گھڑی بے چین رکھے گی۔

دو سلگتے آنسو پی کر میں باہر نکلا تو مارکیٹ کی راہداریاں طے کرتے مجھے صدیاں لگیں۔ ایسے میں غلام علی کی آواز اداسیاں اوڑھے میرا پیچھا کر رہی تھی۔

بے چین بہت پھرنا گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا
عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیرؔ اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا!

☆☆☆

کلوننگ کی پیداوار

اس کے گھر میں آٹا ختم ہو گیا تھا۔

ماں کے کہنے پر وہ دس روپے کا ایک کلو آٹا خرید لایا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مہینے کا منیاری کی دکان سے ادھار سودا سلف لانا گھر کے معمولات میں شامل تھا۔

کبھی کبھار اس کے باپ کی دکاندار سے چخ چخ ہو جاتی تو اس کا خون کھولنے لگتا۔ اسے لگتا تھا اس گھر سے عزتِ نفس کا جنازہ نکل گیا ہے۔ بے روزگاری نے سب کے مزاج چڑ چڑے کر دئے تھے۔ بے روزگاری جو پورے ملک میں بال بکھرائے آوارہ گھوم رہی تھی۔ اور کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔

اب تو اس نے تنگ آ کر اخبار میں آسامیوں کے اشتہار پڑھنے بھی ترک کر دئے تھے۔ ماں جس کے قدموں میں جنت تھی ایک دن اس کے اسرار پر اس نے پھر درخواست دے ڈالی۔ حالاں کہ

اسے معلوم تھا کہ نتیجہ کیا نکلنا ہے۔

ایک لمبی قطار تھی۔

آٹا خریدنے والوں کی نہیں بلکہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ایسے امیدواروں کی جن کے چہروں پر یرقان نے بسیرا کیا تھا۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے میٹرک کا امتحان سائینس کے ساتھ پاس کرنے کے بعد ستر روپے دہاڑی پر پھلکا کمایا تھا۔ اور گھر کی دیواروں سے غربت کھرچنے میں ناکام رہے تھے۔ پانچ آسامیوں کے لئے لگ بھگ پانچ سو امیدوار اپنے اندر امید کی کالی دیوار پر روشنی کے ایک نقطے کے منتظر تھے۔ ان میں وہ بھی تھا جس کے گھر آٹا ختم تھا۔ اور ٹیکنیکل ہینڈ ہونے کے باوجود وہ بے روزگار تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آسامیوں کا اشتہار صرف فارملٹی کے لئے ہوتا ہے۔ چناؤ پہلے سے ہی کر لیا جاتا ہے۔ لیکن سانس کھینچنے کے عمل کے لئے تگ ودو کو وہ فرض گردانتا تھا۔ پرائیویٹ اداروں میں بھی اس نے اپنی سی کوشش کر لی تھی۔ ناکامی ہر جگہ اس کے ساتھ رہی اور اس کا ساتھ نبھاتی رہی۔

اس نے سینکڑوں امیدواروں پر نظر ڈالی۔

سب چہرے ایک جیسے تھے۔ جیسے کلوننگ کی پیداوار ہوں۔

اکا دکا چہروں پر اس نے اطمینان کی لہر دیکھی۔ شاید ان کی جیبوں میں سفارش کے بھاری پتھر رکھے تھے۔ انہی پتھروں کے خوف سے اس کا خیال تھا کہ انٹرویو پینل والے ان کا چناؤ کر لیتے تھے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازوں میں اس کے اندر کی آواز کسی تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ چپ تھا شاید سارے ہی چپ تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھے امیدوار نے جب اس سے سوال کیا کہ اس کی تعلیم کیا ہے اور کیا وہ کسی سفارش کی بنیاد پر آیا ہے تو اس کا جی چاہا وہ اسے بتا دے کہ ہم سب یوں ہی آئے ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی نوکری نہیں ملے گی۔

یار۔۔۔ تم سفارش کی بات کرتے ہو۔ اپنے گھر تو اب بھوک پکتی ہے۔

مایوس کیوں ہو۔۔۔؟ مایوسی تو کفر ہے۔

میں اس کفر کا عادی ہو گیا ہوں۔ وہ سامنے والے نوجوان کو دیکھ رہے ہو۔ جس نے اپنے لمبے بال پیچھے کی طرف ڈال رکھے ہیں۔

دیکھ رہا ہوں۔

یہ چیئرمین کا سگا بھانجا ہے۔اسی لئے تو چہک رہا ہے۔اوران میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کی پشت پر کرنل، برگیڈیئر اور جرنل بھی ہیں۔بعض لمبا مال لگا کے بھی آئے ہیں۔بس دیکھتے جاؤ۔

یار جب ملک ان کا ہے۔سیاہ وسفید کے یہ مالک ہیں تو ہم کس قطار اور شمار میں ہیں۔۔۔۔؟

قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔؟

نام پکارے جارہے تھے

اور امیدوار ایک ایک کر کے اپنی باری پر اندر جاتے اور مایوسی کی چادر اوڑھ کر باہر نکل آتے۔اس کی باری کہیں شام ڈھلے آئی تب تک وہ تھکن سے چور ہو چکا تھا۔اس کا جب نام پکارا گیا تو اسے یہ یاد ہی نہیں تھا کہ اس کے گھر آٹا ختم ہو چکا ہے۔وہ پورے اعتماد سے اندر داخل ہوا۔

May I come in sir

Yes, come in

اسلام اعلیکم۔۔۔۔۔۔اس کے لہجے میں شائستگی تھی

وعلیکم السلام۔۔۔

افسران پورے کرّ وفر کے ساتھ اپنی اپنی آرام دہ کرسیوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ان میں سے کسی کے گھر بھوک نہیں پکتی تھی

اس نے فائل ان کے سامنے رکھی

ڈائریکٹر نے اس کے کاغذات کو ایک نظر دیکھا اور پینل میں موجود افسران سے سوال پوچھنے کا کہا۔پینل کے افسران کے چہروں پر ایک اطمینان تھا۔وہ پراعتماد تھا اور اس نے پورے اعتماد سے سوالوں کا جواب دیا۔جب وہ باہر نکلا تو جانے اسے کیوں یقین تھا کہ اس کا چناؤ کر لیا گیا ہے۔اسے تھکن اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے جانے کیسے جرات کر کے کہہ دیا تھا کہ اس کے گھر صرف ایک وقت کا آٹا باقی ہے۔یہ سوچ کر کہ ممکن ہے کسی افسر سینے میں دل بھی ہو۔

سر۔۔۔اس نوجوان کو **Appoint** کر لینا چاہیئے۔ایک آفیسر نے کہا بات تو ٹھیک ہے۔نوجوان انتہائی **Talented** ہے۔ادارے ایسے ہی ٹیلنٹڈ ایمپلائیز سے **Run** کرتے ہیں۔لیکن۔؟

لیکن کیا۔۔۔سر۔۔۔؟ایک سینئیر ترین آفیسر نے پوچھا

چیئر مین صاحب کے بھانجے کا کیا کیا جائے۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

کافی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی آواز کے سوااور کوئی آواز نہیں تھی۔

اسے کسی اور کھاتے میں کھپانے کی کوشش کر لیں گے۔

ناممکن۔۔۔۔ڈائیریکٹر نے کہا۔

میں اس روز ان کے گھر موجود تھا جب ان کی ہمشیرہ ان سے اپنے بیٹے کے لئے جھگڑ رہی تھی۔ چیرمین صاحب کا کہنا تھا کہ اداروں کو چلانے کے لئے ہمیں ٹیلینٹڈ اذہان کی ضرورت ہوتی ۔اور میرا بھانجا پرلے درجے کا نالائق اور لا پرواہ ہے۔ چار پیسے دے کر اس نے ڈگری تو لے لی ہے لیکن وہ اس اسامی کے اہل نہیں ہے۔

ان کی ہمشیرہ تراخ سے بولی ۔یہ ملک اور اس کا قانون ساز ادارہ انگوٹھے چھاپ ممبران سے چل سکتا ہے تو آپ کا ادارہ میرے بیٹے کے ساتھ کیوں نہیں چل سکتا۔

چیئر مین صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

تو پھر کیا کیا جائے۔۔۔؟

سر۔۔۔اس نوجوان کو تو ہمیں ہر حال میں **Appoint** کرنا چاہئے۔ کیوں کہ جو مشینری ہم نے باہر سے امپورٹ کی ہے۔اسے ایسے ہی قابل ٹیکنیشین چلا سکتے ہیں۔

ڈائیریکٹر نے اس نوجوان کو **Appoint** کرنے کا حتمی فیصلہ دے دیا۔

اگلے روز چیئر مین صاحب کی میز پر جب فائل پہنچی تو وہ سیخ پا ہو گئے اور ساری اسامیاں کینسل کر دیں۔

یہ آپ لوگوں نے کیا کیا ہے۔۔۔؟

سر۔۔۔اس نوجوان نے انٹرویو میں سو فیصد نمبر حاصل کئے تھے۔

کسی جرنل کی کوئی سفارش تھی کیا۔۔۔؟

نہیں سر۔۔۔۔

تو پھر۔۔۔؟

سر۔۔۔قابلیت کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ اس کے گھر صرف ایک وقت کا آٹا تھا۔

توگندم کی بوری بھجوادی ہوتی۔
اوراخبار میں دوبارہ Advertizement دینے کا حکم جاری فرما کر میٹنگ برخواست کردی۔
چندروز بعد اس کی ماں اخبار میں ایک اشتہار دیکھ کر چونکی
"بیٹا۔۔۔۔یہ تو وہی اسامی ہے۔۔نا۔۔۔جس پر تم نے اپلائی کیا تھا۔
جی۔۔۔۔امی۔۔!
تو یہ اشتہار دوبارہ کیوں چھپ گیا ہے۔
امی رہنے دیجئے۔۔۔۔اس ملک کی ساری بیوروکریسی اور اربابِ اقتدار کے چہرے ایک سے ہیں۔یہ سب کلوننگ کی پیداوار ہیں۔

خواب میں پیوست کانٹا

اس کے لاشعور میں ایک خواب کانٹے کی طرح اٹک گیا تھا۔جو ہر رات اس کے خواب میں عذاب ہو جاتا اور دن بھر اسے بے چین رکھتا۔خواب عملی زندگی میں اس کے لئے عذابِ مسلسل ہوتے جارہے تھے۔یہ خواب رک کیوں نہیں جاتا۔۔۔۔؟ ایک سا عمل بار بار کیوں۔۔۔۔؟ مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہوگئی ہے۔۔۔؟ حالانکہ اس کی پوری زندگی اغلاط کا مرقع تھی۔انتشار کی آخری سرحدوں پر کھڑی اس کی سوچیں اس کو مضمحل کئے دے رہی تھیں وہ اس کشمکش سے آزادی کا خواہاں تھا۔اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا باطنی معبر سورہا ہے۔اس نے اس معبر کو جگانے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔
خواب اس کے دماغ میں کیل کی طرح گڑا تھا۔
اسے ہر رات ایک کنویں میں گرادیا جاتا۔وہ کنویں میں گرتا ہی چلا جاتا۔بہت گہرا کنواں جس کا

کوئی انت نہیں تھا۔ وہ اس انتظار میں چیختا رہتا کہ ابھی کنویں کے پیندے سے جا ٹکرائے گا۔ لیکن کنواں ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا۔ اچانک ہاتھ پاؤں مارتے مارتے وہ چارپائی سے نیچے آ رہتا۔ اس کی بیوی گھبرا کے اٹھتی اسے سنبھالتی۔ پانی لا پلاتی۔

صبح ہونے پر وہ زندگی کے معمولات میں تو کھو جاتا۔ لیکن اس کے لاشعور میں خواب اودھم مچاتا رہتا۔

بے تکلف دوستوں کہ کہنے پر کہ تم نے خواہ مخواہ خوابوں کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے۔ یہ معدے کی گرانی کا اثر ہے۔ کسی حکیم سے رجوع کرو۔ وہ یہ بات ماننے کو کسی طور تیار ہی نہیں تھا۔ کہ خوابوں کا عملی زندگی سے تعلق ہی نہیں ہے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ عملی زندگی گناہ آلود ہونے سے خواب آنے ہی بند ہو جاتے ہیں۔ جیسے ایک دم اندھیرا چھا جائے کچھ سجھائی نہ دے۔ اندھیرے میں راستہ کیسے تلاش کیا جائے۔۔۔؟ خواب تو روشنی کی علامت ہوتے ہیں۔ سجن اور میت۔۔۔!

وہ بیاضِ زندگی کا اگلا ورق الٹنا چاہتا تھا۔

اسے اپنے حصے کے گناہ معلوم تھے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ ان گناہوں کی وجہ سے ہی میرے خواب آنکھ کھلنے پر مجھے یاد نہیں رہتے۔ وہ ایسی زندگی جینا چاہتا تھا۔ جس سے اس کے خواب سنور جائیں۔ وہ برسوں سے ایک ایسے انسان یا ایک ایسی کتاب کی تلاش میں تھا۔ جو اس کی باطنی دنیا بدل دے۔

انسانوں اور کتابوں کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے اس کی ملاقات ایک روز ایک ایسے شخص سے ہوگئی جو دیکھنے میں ایک عام سا دنیادار شخص تھا۔

وقت کو اپنا ورق الٹنے میں دیر ہی کتنی لگی۔ ایک شام اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے مغلئی طرزِ تعمیر کی مسجد میں اس شخص کو نمازِ مغرب ادا کرتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خاموشی اور تفکر کی دبیز تہہ تھی۔ بال پریشاں' ڈاڑھی ندارد' پاؤں کے دونوں انگوٹھے جوڑے وہ اکڑوں بیٹھا عالمِ استغراق میں تھا۔ نمازی ایک ایک کر کے چلے گئے۔ وہ مسجد میں تنہا رہ گیا۔ یہ شخص بیٹھا کیوں ہے۔ اسے اب اٹھ جانا چاہیے۔ وہ اس سے علیک سلیک کرنے کو بے تاب تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے گرد نور کا ہالہ تھا۔ جیسے بہت سے فرشتے آسمان سے اتر کر اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے ہوں۔ شفق کی لالی میں رات کی سیاہی گھلنے لگی۔ مسجد کے گنبدوں پر چاند کی کرنوں کا نور اترنے لگا۔

یہ اٹھ کیوں نہیں رہا۔۔۔۔؟۔
اس کی بے قراری سوا نیزے پر تھی اور وہ اطمینان کی ردا اوڑھے پر سکون بیٹھا تھا۔کیا اکیسویں صدی میں بھی ایسے قلبی سکینت والے اشخاص موجود ہیں۔۔۔۔؟
ایک سوال یہ بھی تھا کہ وہ اس کا انتظار کیوں کھینچ رہا ہے۔۔۔؟
جب وہ اٹھ کر سیدھے قد کھڑا ہوا تو وقت کی رفتا بدل گئی۔وہ اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔
اسلام وعلیکم۔۔۔۔۔
وعلیکم السلام۔۔۔۔
ایک دوجے پر رحمت کے تبادلے کے بعد وہ مسجد کی سیڑھیاں اترے۔
یہ وقت کا پیمانہ کیسے بدلا۔وہ ایک کیسے ہو گئے۔۔۔؟
مسجد کے سامنے برآمدے کی تعمیر بھی مغلئی طرز پر تھی۔برآمدے کے پیچھے کمروں کی لمبی قطار تھی اور ان کی پشت پر اس کا گھر تھا۔
اس نے اسے چائے کا کہا تو وہ مسکرا دیا۔
گھر قدم دھرنے پر سب سے پہلے اس شخص نے صحن میں لگے سمبل کے اکلوتے درخت کو غور سے دیکھا۔
کوئی خاص بات۔۔۔۔۔؟اس نے اجنبی شخص سے پوچھا
سب اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔زمین وآسمان میں سب اس کی تسبیح کرتے ہیں۔یہ سمبل کا درخت ہے۔اس کے پھول گہرے سرخ رنگ کے اور کپاس نرم ہوتی ہے۔اس نے برآمدے میں رکھے گملوں کے پودوں کو بہ نظرِ غائر دیکھا۔انہیں چھو کر مسکرایا۔
یہ سب۔۔۔ہاں یہ سب اپنے خالق کا ذکر کرتے ہیں۔ایک ہم انسان ہی۔۔۔۔؟ وہ چپ ہو گیا۔اس کا جی چاہ رہا تھا وہ بولتا رہے۔اس کی باتوں میں مٹھاس تھی۔کوئی ایسا کیمیائی عمل تھا جو اندر کی کیمسٹری بدلتا تھا۔
ہم انسان ہی۔۔۔۔اس نے بات ادھوری چھوڑ دی
بہت پیچھے رہ گئے۔اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔
وہ کیسے۔۔۔؟

ہم دین کے رہے نہ دنیا کے۔ روحانی میراث بھی گنوا بیٹھے اور مادی طور پر اتنی ترقی بھی نہ کر سکے کہ آج دشمنوں کے لئے لقمۂ تر تو ثابت نہ ہوتے۔ وہ ہمیں نگلتے جا رہے ہیں۔ ہم نہ کوئی ایسی لیزر ریز تیار کر سکے جس سے چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر جاتے جہاز کو مار گراتے اور نہ ہی نگاہِ مردِ مومن ہے کہ ہوا میں ہی ان کے پرخچے اڑ جاتے۔

اس کا نام غیاث الدین تھا۔

ہم نے اپنے آپ کو ہی تباہ کر ڈالا۔

چائے آنے تک فضا اور گفتگو بے تکلفی کی سرحدوں تک جا پہنچی تھی۔

جس کمرے میں وہ محوِ گفتگو تھے وہ کتابوں سے لبالب بھرا تھا۔ تاریخ' اسلام' تفسیر' حدیث' فقہ' فلسفہ' شاعری' ناول' افسانہ اور کئی موضوعات پر سینکڑوں کتابوں کے درمیان وہ اپنی تلاش میں تھے۔ وہ کتابوں کو غور سے دیکھتا رہا۔

آپ کو ایک خواب سالہا سال سے پریشان کر رہا ہے۔۔۔۔۔! اس نے اچانک کہا

تحیر کی جگہ اب اس کے اندر یقین نے لے لی تھی۔۔۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

یہ ہوتا ہے۔۔۔ یہ Intimation ہوتی ہے۔ یہ اطلاع ہوتی ہے۔ ہماری زندگی سولہ گھنٹے نہیں ۔بلکہ چوبیس گھنٹے ہے۔ اگر آٹھ گھنٹے کے خواب پریشاں ہو جائیں۔ تو وہ آٹھ گھنٹے منفی ہونے سے پوری زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہی آٹھ گھنٹے سسٹم کو درست رکھنے میں سمت نما کا کام کرتے ہیں۔ اب ہمیں وہ کڑی تلاش کرنی ہے۔ جس نے آپ کی عملی زندگی کو بے چین کر رکھا ہے۔

کڑی تلاش کرنے میں اس نے اس کے معمولات کا مکمل جائزہ لیا۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ پر وہ بہت دیر بات چیت کرتا رہا۔ جانے وہ اس کے ہاتھ کی لکیروں میں کیا تلاش کرتا رہا۔۔۔؟

آ گئی۔۔۔ آ گئی بات سمجھ میں آ گئی

وہ غیاث الدین کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔۔۔ اچھا ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔ کئی کڑیاں گم ہیں ۔۔۔ معاملات کا باب گنجل ہے۔ اتنی گانٹھیں کیسے کھلیں گی۔۔۔۔؟ کچھ تو خیال کیا ہوتا۔۔ خیر ابھی دروازہ کھلا ہے۔۔۔ اور کھلا رہتا ہے۔۔۔ نزع کا عالم طاری ہونے تک۔۔۔ لیکن یہ تو حقوق

العباد کا معاملہ ہے۔۔۔اس کی معافی تو حج ادا کرنے اور شہید ہو جانے سے بھی نہیں ہوتی۔
وہ بول رہا تھا۔۔۔۔
اس نے ایک کتاب کا ورق الٹتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔رقم کتنی ہو گی جو آپ کے ذمہ واجب الادا ہے۔۔۔؟
حساب کر کے میں آپ کو بتاؤں گا
کئی دن موسموں کی طرح گزر گئے۔اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔
ایک روز وہ غیاث الدین کے گھر گیا
دماغ میں پھیلے لاینحل سوالات کا پھر اسے سامنا تھا۔''کافی'' کو مگ میں پیسٹ کرتے ہوئے اس نے سے سوال کیا
تو حساب لگا لیا آپ نے۔۔۔۔کتنی رقم کی ادئیگی آپ کے ذمہ واجب الاداء ہے۔۔۔۔؟
جی۔۔۔۔قریباً چالیس ہزار روپے۔۔اور میں کسی ایک شخص کا مقروض نہیں بلکہ کہیں ہزار روپیہ ادا کرنا ہے تو کہیں صرف نوے روپیہ میرے ذمہ نکلتا ہے۔کل ملا کر یہ رقم چالیس ہزار کو پہنچتی ہے۔
نوے روپے کی رقم تو بہت زیادہ ہے۔۔۔آپ کو پائی پائی ادا کرنا ہے۔
تو کیا اس ادئیگی کے بعد مجھے اس خواب کے عذاب سے رہائی مل جائے گی۔
بالکل مل جائے گی۔۔۔
تم نے ان تمام لوگوں سے رابطہ کرنا ہے۔جن کے حقوق تمہارے ذمہ ہیں۔تم نے صلہِ رحمی کا اہتمام کرنا ہے۔۔فرائض کی ادئیگی میں تمہاری غفلت دور کرنی بہت ضروری ہے۔
مجھے ریاکاری سے خوف آتا ہے۔
ریاکاری سے بھی اللہ ہی بچانے والا ہے۔بس تم سفر اس شخص کی طرح جاری رکھو۔جسے ایک بار حج کے دوران لبیک لبیک کہنے پر آواز آئی
لا لبیک۔۔۔
وہ پھر بھی طواف کرتا اور بھاگتا رہا۔۔۔لبیک لبیک۔۔۔اللھم لبیک۔۔۔لاشریک لک۔۔۔
کسی نے اسے کہا۔۔۔جب تمہارا حج قبول ہی نہیں تو کیوں پاگلوں کی طرح بھاگ رہے ہو۔
وہ رکا۔۔۔اور کہا۔۔۔کہاں جاؤں۔۔۔؟اس کے سوا اور کوئی در بھی تو نہیں

اگلی بار لبیک کہنے پر اس کا حج قبول کر لیا گیا۔

اس نے غیاث الدین کے بتائے ہوئے راستے پر اپنا سفر جاری رکھا۔

اس سارے سفر میں اسے قرض کے معاملات میں زیادہ دقت کا سامنا ہوا۔ برس ہا برس کا حساب جوڑ کر اس نے ایک فہرست مرتب کی۔ ان برسوں کی تلاش میں وہ نکلا۔ کہیں بارہ برس تو کہیں بیس برس سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس نے ایک ایک در پر دستک دی اور قرض لوٹائے۔ ایک قریبی دوست کو جب اس نے بیس برس بعد اسی روپے لوٹائے تو اس نے شکریہ ادا کر کے رکھ لئے۔

اس رات وہ بستر پر لیٹا بہت دیر اسی بات پر غور کرتا رہا۔ کہ جب تک صاحب حق خوش دلی سے حق معاف نہ کرے۔ معافی نہیں ہوتی۔

جیسے جیسے اس کی زندگی سیدھے راستے پر رواں ہوتی گئی اس کے خواب بھی قوسِ قزح کی طرح نکھر گئے۔

ایک رات خواب میں اس نے دیکھا۔ کہ وہ سرسبز وشاداب جنگلوں کے اوپر پرواز کر رہا ہے۔ اسے خوابوں میں صلحاء کی زیارت ہونے لگی۔ وہ مطمئن اور مسرور ہو گیا کہ اس کے خوابوں کی سرزمین سرسبز وشاداب ہو گئی تھی۔

لیکن ایک رات اس کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا بدن پسینے میں تر بہ تر تھا۔ دل کی دھڑکن تیز تھی۔

خواب نے اس کے پورے وجود میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔

اس نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔۔۔۔۔! ترقیِ معکوس نے اسے الجھا کر رکھ دیا۔

اسکے خوابوں میں اس کے ماضی نے پھر ڈیرے ڈال لئے۔

کیونکہ اس کے ذمہ چالیس ہزار روپیہ واجب الاداء تھا۔

☆☆☆

برائے فروخت

ڈیپارٹمنٹل سٹور کا مالک گاہکوں کے ساتھ اس درجہ مصروف تھا کہ مجھے بہت دیر اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ وہ چوں کہ رقم دھڑا دھڑ اپنے سیف میں ڈال رہا تھا۔ سیف جس پر ڈیجیٹل میٹر رقم نہ صرف کاؤنٹ کر رہا تھا بلکہ ساتھ لگے پرنٹر پر اس کا پرنٹ آؤٹ بھی نکل رہا تھا اس کے سامنے لال نیلے اور سبز نوٹ تھے۔ گاہکوں سے رقم لے کر Automatic سیف میں ڈالتے ہوئے اسے نوٹوں کے سوا اور کیا سوجھ سکتا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا۔ کہ وہ ذرا فارغ ہولے تو میں اسے اپنی جانب متوجہ کروں۔ پھر اس لمبے کاؤنٹر پر میں نے ایک نظر ڈالی کہ جو سیلز مین فارغ ہو اس سے ہی بات کر لوں ایک چھریرے بدن کی لڑکی جس نے کسی ہوئی جینز پہن رکھی تھی اور باریک شرٹ میں سے جھانکتا اس کا بدن پورے ڈیپارٹمنٹل سٹور میں موجود لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ کھڑی مائل بہ فربہی خاتون اپنے کھلے بالوں کو سہلا رہی تھی۔ سیلز مین کی توجہ پوری کی پوری ان پر تھی۔ اس نے متعدد میڈیسنز اور

کھانے پینے کی انواع واقسام کی اشیاان کے سامنے ڈھیر کر رکھی تھیں۔ان کی انگلیوں کے ناخن بڑھے ہوئے تھے اوران پر لباس سے میچ کرتی نیل پالش لگی تھی۔وہ انگلی کے اشارے سے جس چیز کی طرف اشارہ کرتیں سیلز میں روبوٹ کی طرح وہ چیز اتار کران کے سامنے لا رکھتا۔

مجھے الجھن ہونے لگی۔مجھے اپنی خریداری تسلی سے کرنا تھی اور یہاں تسلی کا سرے سے امکان ہی مفقود تھا۔ایک سیلز مین کو ذرا فارغ دیکھ کر میں اس کی طرف لپکا ابھی میں نے بات شروع بھی نہیں کی تھی کہ اس نے سٹور سے داخل ہونے والے ایک صاحب کا چہرہ دیکھ کر اپنی پوری مسکراہٹ ان پر انڈیل دی۔

آیئے زردار صاحب۔۔۔بھابی اب کیسی ہیں۔۔۔؟

ڈاکٹر تبدیل کیا ہے۔امید تو اس نے بہت دلائی ہے۔دیکھیئے اللہ کو کیا منظور ہے۔اس نے نسخہ سیلز مین کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

سیلز مین نے بجلی کی سی سرعت سے ادویہ نکال کرانہیں کاؤنٹر پر ڈھیر کیا۔

یہ انجکشن امپورٹڈ ہے اور کیپسول جرمنی کے ہیں۔چند انجکشن' کیپسول' کچھ ٹرینکولائزرز کا بل اس نے آٹھ ہزار تین سو چالیس روپے بتایا۔صاحب نے ایک Credit Card اس کے ہاتھ میں تھمایا۔اور شاپر اٹھائے سٹور سے نکل گئے۔میں حیران ہو رہا تھا کہ آنے والے گاہکوں میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جن کے سامنے سیلز مین ٹرینکولائزر ہی رنگ برنگی Packings میں سے نکال کر رکھ رہے تھے۔

یہ پوری قوم اس نشے کی عادی ہوگئی کیا۔۔۔؟

ان کی نیند کیا ہوئی۔۔۔؟

کس بات کی عجلت نے ان سے دن کا چین اور رات کی نیند چھین لی۔یہ کیوں بولائے بولائے پھرتے ہیں۔ان کے بنک بیلنس ہیں۔لمبی لمبی کاریں اور لش لش کرتی بیویاں ہیں۔کروڑوں کے پلاٹ' پلازے اور شہر شہر انہوں نے کوٹھیاں بنا رکھی ہیں۔سفر یہ زمین کی بجائے فضا میں کرتے ہیں اسی لیے تو انہیں زمین والوں کے دکھ معلوم نہیں۔دولت ان کے گھر کی لونڈی' رکھیل اور کار کا روز نیا ماڈل ان کا شوق ٹھہرا۔ان بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹوروں میں بغیر مول تول کئے یہ اس طرح خریداری کرتے ہین جیسے عالمی منڈی میں ضمیر فروشی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔

لیکن میں ان کے بارے اتنا متفکر کیوں ہوں ۔ مجھے تھوڑی سی تو خریداری کرنی ہے اور میں اسی سٹور کا ہو کر رہ گیا ہوں ۔ میں یہاں ہر شخص اور ہر شے کو یوں انہماک سے دیکھ رہا ہوں جیسے اس سٹور کا مالک میں ہوں یا مجھے ہمیشہ یہیں رہنا ہے ۔ مجھے اس سٹور سے فوری نکل جانا چاہیئے ۔ میں اسی کا ہی نہ ہو کر رہ جاؤں ۔ مجھے پلٹ کر اپنی زندگی بھی تو گزارنی ہے ۔ یہ شہر جانے اس کا مزاج اور اس میں رہنے بسنے والی

مخلوق ۔۔۔۔!

میں تو دو دن کے لیے اس شہر میں آیا ہوں اور چند لمحوں کے لیے اس سٹور میں ۔ لیکن میں کیا کروں ۔۔؟

میں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی رات کا ایک بجا تھا اور اسلام آباد کے جس ڈیپارٹمنٹل سٹور میں اس وقت میں کھڑا تھا وہاں رات اترنے کا کوئی امکان نہیں تھا ۔ پہلے تو مجھے اپنے آپ سے شرم آئی کہ رات جسے ربِ کریم نے میرے لیے لباس کی مانند بنایا تھا میں اس لباس کو تار تار کر رہا ہوں ۔ جب میں اس لباس کو تار تار کروں گا تو پھر مصنوعی نیند کے لیے ٹرینکولائزر زندگی عذاب نہیں کریں گی اور تو اور کیا گل کھلائیں گی ۔ نیند جو آرام کا ذریعہ تھی اس کی لاش ہم اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں ۔

میں یہ بھول گیا کہ میں یہاں کس کام سے آیا تھا ۔ برق رفتار زندگی میں یاد رہ بھی کیا سکتا ہے ۔ آسائیشات کی دوڑ نے ہمیں اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ ہماری زندگی کا پورا پیٹرن ہی مصنوعی ہو گیا ہے ۔

سیلز مین نے جیسے ہی جمائی لے کر بازو ڈھیلے چھوڑے ۔ میں نے اس سے پوچھا

یہ سٹور رات کتنے بجے تک کھلا رہتا ہے ۔۔۔؟

تقریباً دو اڑھائی بجے تک ۔۔

آپ کے سٹور میں تو قیامت خیز رش ہے ۔ خاص کر آپ کے Madecine Side کی Sale بہت زیادہ ہے ۔۔۔

یہ سب اللہ کا کرم ہے ۔۔۔ آپ کو کون سی میڈیسن چاہیئے ۔۔۔؟

مجھے میڈیسن نہیں ایک تازہ افسانہ چاہیئے

پلیز آپ سامنے والے کاؤنٹر پر پوچھ لیجئے آج کل افسانہ صرف ڈیمانڈ پر ہی تیار کیا جاتا ہے
میں دوسرے کاؤنٹر پر گیا اور کہا مجھے ایک تازہ افسانہ چاہئے۔۔
آپ کو افسانہ کس لئے چاہئے۔۔۔؟ سیلز مین نے مسکرا کر پوچھا
میرے ایک دوست نے اپنا ادبی جریدہ نکالا ہے۔
شوقِ ناموری کے لیے۔۔۔!
نہیں نہیں۔۔۔ادب کی خدمت کے لیے
ادب کی خدمت والے افسانے ہمارے پاس نہیں ہیں۔
تو آپ کے سٹاک میں اس وقت کون کون سے ورائیٹی ہے۔۔۔؟
چند افسانے ساٹھ والی دہائی کے پڑے ہوں گے۔کہانی پن والے بھی ہیں۔لیکن زیادہ ڈیمانڈ ان دنوں تیسرے درجے کی بازاری کہانیوں اور افسانوں کی ہے۔ڈائجسٹ دھڑا دھڑ بکتے ہیں۔ان کی سیل اور مارکیٹ بھی ہے۔
اور شاعری کی کیا کیا ورائیٹی ہے آپ کے پاس۔۔۔؟
شاعری کا مسئلہ نہیں ہے وہ تو آرڈر پر ہم رات میں پوری کتاب تیار کرا دیتے ہیں۔
اور ناول یا افسانہ۔۔۔؟
ناول کے خریدار بہت کم ہوتے ہیں۔
اور افسانہ۔۔۔؟
جس قسم کا افسانہ آپ کو چاہئے وہ آپ کو مارکیٹ سے نہیں ملے گا۔
وجہ۔۔۔؟
خالص افسانہ عنبر کستوری اور زعفران کی طرح مہنگا اتنا ہو گیا ہے کہ ہم نے خریدار نہ ہونے کی وجہ سے رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔۔۔!
آپ کو طب سے بھی علاقہ ہے۔۔۔۔
ظاہر ہے جی ہم Comercial Age سے گزر رہے ہیں۔ورائیٹی کے بغیر مارکیٹ میں زندہ رہنا
ناممکن ہے۔۔۔۔

میں ایک کام کے سلسلے میں آیا تھا

خیال آیا کیوں نہ ریڈی میڈ افسانہ خرید کر اپنے دوست کو بھجوا دوں۔

آپ اسے ساٹھ کی دہائی کا ہی کوئی افسانہ اٹھا کر بھیج دیں۔تجریدی آرٹ اور علامتی افسانے کا یہی تو کمال ہے کہ دونوں کی سمجھ نہیں آتی اور قاری آہ واہ کے درمیان لٹکا رہ جاتا ہے۔!

میرا ارادہ تھا کہ کسی اور سٹور سے افسانے کا پتہ کرلوں۔شاعری بکتی ہے۔آخر افسانے بھی کہیں نہ کہیں تو بکتے ہوں گے۔

چلئے جو افسانے ہیں وہ تو دکھایئے۔۔۔

میں نے فہرست پر نظر ڈالی۔عجیب وغریب موضوعات تھے۔ایک پلندہ سامنے آیا۔اول تا آخر جنسی موضوعات اور تحریر بھی اتنی توانا نہیں تھی۔۔۔!

آپ ایسے افسانے بھی بیچتے ہیں۔۔۔؟

گزشتہ ماہ ایک نوجوان جسے افسانہ نگار بن جانے کو شوق چرایا وہ ہمارے یہاں آنکلا۔اسے ایسا ہی موضوع پسند آیا۔اور اس نے وہ پندرہ افسانے ایک لاکھ روپے میں خرید لیے۔ہم نے تیس ہزار روپے اپنے قلم کار کو پیش کئے اور ہمارا پرافٹ ستر ہزار روپے رہا۔

یہ زیادتی نہیں ہے کیا۔۔۔؟

آپ کیا بات کرتے ہیں صاحب۔۔۔!

ہمارے سٹور میں ضمیر بھی بکتے ہیں

میں سمجھا نہیں

اس شہر میں ایک عرصے سے لوگ اپنا ضمیر بیچ رہے ہیں۔اور ضمیر بھی سستے داموں۔ہم نے سوچا کیوں نہ ہم یہ ضمیر عراقی کرنسی کی طرح کوڑیوں کے مول خرید لیں شاید کسی روز قسمت یاوری کرے اور انسانوں کو زندہ رہنے کے لیے دوبارہ ضمیر کی ضرورت پڑے تو پھر ہم منہ مانگے دام کھرے کر لیں گے۔

ضمیر کہاں رکھے ہیں آپنے۔۔۔؟

وہ آئس Boxes میں ہم نے فریز کیے ہیں۔تاکہ خراب نہ ہوں۔انسانی وجود کا یہ سب سے قیمتی آئیٹم ہے۔اس لیے ہم اس حوالے سے مطمئن ہیں کہ ہم نے انہیں محفوظ کرلیا ہے۔

یہ بھی تو ممکن ہے بغیر ضمیر کے ہی یہ نظام چلتا رہے اور آپ کی یہ انوسٹمنٹ ضائع ہو جائے۔
ناممکن ۔۔۔انسان اس جوہر کے بغیر زیادہ عرصہ Survive نہیں کر سکتا۔ ہمارا یقین ہے ایک روز ہماری انوسٹمنٹ ہمیں Big Profit دے گی۔
آپ کوک لیجئے۔۔۔؟
اس نے کوک مجھے پکڑا کر مجھ سے سوال کیا
کیا آپ ہمارے ساتھ Agriment کریں گے۔آپ کے افسانوں پر ہم ففٹی پرسنٹ دیں گے۔کل ایک خاتون آئی تھیں۔ وہ منہ مانگی قیمت دینے پر راضی ہو جائیں گی۔وہ بھی ایسے ہی افسانے ڈیمانڈ کر رہی تھیں جیسا آپ نے ڈیمانڈ کیا۔چلئے شوقِ ناموری میں اگر پانچ لاکھ پر وہ کتاب کے لئے راضی ہو گئیں تو تین لاکھ آپ کا اور دو لاکھ ہمارا۔۔۔! یہ رعایت صرف آپ کے لیے۔ہم ففٹی پرسنٹ سے بھی آپ کو زیادہ دے رہے ہیں۔
یعنی تخلیق میری اور تختی اس خاتون کے نام کی۔۔۔!
یہ تو بزنس ہے ناصاحب۔۔آپ دیکھئے، تعلیم اور علاج مکمل طور پر کمرشلائیز ہو گئے ہیں۔منہ مانگی فیس، انگلش میڈیم میں نیویارک کا کورس، اور کاپیوں کتابوں کا بزنس الگ Profitable ہے۔
اس دور میں جب ہر چیز کمرشلائیز ہو گئی ہے۔آپ اپنے افسانے کو لے کر بیٹھے ہیں۔
بھائی میں مرنے کے بعد اپنے کتبے پر قلم فروش نہیں لکھوانا چاہتا۔
ابھی ہم محوِ گفتگو تھے کہ ایک دراز قد خاتون سٹور میں داخل ہوئی۔اس کے کندھے پر پرس جھول رہا تھا۔اور شیمپو کے اشتہارات کی طرح اسکی زلفیں کھلی تھیں۔آستین ہاف بازو سے جانے کندھے تک کب غائب ہوئی۔وہ خاتون سیدھی اسی کاؤنٹر پر آئی جہاں ہم کھڑے تھے۔میرے کام کا کیا ہوا۔۔؟اس نے آتے ہی سوال کیا۔ہمیں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی، یہ صاحب ایسے افسانے لکھ کر دے سکتے ہیں جو صفِ اول کے ادبی جرائد میں چھپ سکیں لیکن یہ کسی قیمت پر راضی نہیں ہو رہے۔سیلز مین نے میری طرف اشارہ کیا
اب خاتون مجھ سے مخاطب تھی۔آپ کے لیے کیا مشکل ہے آپ پندرہ سے بیس افسانے دے دیجئے اور قیمت بتائیے۔خاتون۔۔۔فن اتنا سستا نہیں کہ اسے بے جان کرنسی نوٹوں سے خرید لیا جائے۔ابھی کل ہی انہوں نے مجھے شاعری کی ایک کتاب دکھائی ہے۔

شاعری کی بات اور ہے اور وہ بھی تیسرے درجے کی شاعری۔۔۔وہ بکتی ہے مان لیا۔۔خاتون معیاری ادب کہیں بھی آپ کو کروڑوں روپے میں بھی دستیاب نہیں ہوگا۔جب آپ اپنے اندر سے اپنا غم باہر کھینچ لائیں گی اور اسے آپ کو رقم کرنا آجائے گا تو آپ قلم کار ہو جائیں گی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔۔رات بہت ہو گئی تھی اور مجھے لوٹنا بھی تھا۔

افسانہ بھی میرا منتظر ہوگا۔میں نے سوچا

ڈیپارٹمنٹل سٹور میں تو میں کچھ ہی دیر کو آیا تھا۔خریداری کرنے۔وگرنہ میری دنیا تو کوئی اور تھی جہاں مجھے واپس لوٹنا تھا۔جب میں سفر سے واپس گھر اپنی سوزوکی کار پر پہنچا تو مجھ سے شریکِ سفر نے سوال کیا

افسانوں کا کیا بنا۔۔۔؟ کیا ایک بھی افسانہ نہیں بکا۔۔۔؟ آپ تو کہتے تھے لاکھوں میں بک جائیں گے۔

آپ تو واپس اپنی اسی کھٹارا سوزوکی پر لوٹ آئے ہیں۔میں تو نئی کرولا کا انتظار کر رہی تھی۔

افسانے تو با آسانی فروخت ہونے لگے تھے جیسے لاٹری نکل آتی ہے۔

☆☆☆

بہت دیر کردی

افسانہ نگار کو یہ افسانہ بہت سال پہلے لکھ لینا چاہئے تھا۔
بہت دیر کردی اس نے اب تو فضا میں آکسیجن کی جگہ صرف بارود کی بو ہے اور مشرق کی پوری نسلِ انسانی کو اسی بارود کی بو میں سانس کھینچنا ہے۔ ہوا کا رخ یہ بتاتا ہے کہ آنے والے دنوں میں فضا میں آکسیجن کی جگہ صرف بارود لے لے گا۔
قلم میں بھی روشنائی کی جگہ اب بارود ہے۔
الفاظ بھی بارود میں ڈھل رہے ہیں۔
یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایک طالع آزما صدام حسین نے کویت کو تاراج نہیں کیا تھا۔
یہ ان لمحوں کی کہانی ہے جب امریکہ نے کویت سے عراقی افواج کو نکالنے کے بہانے ابھی دو درجن سے زائد ممالک کے اشتراک کے ساتھ بغداد پر چڑھائی نہیں کی تھی۔
یہ کتھا اس وقت کی ہے جب ابھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر سینہ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے انہدام نے دنیا کی

کیمسٹری نہیں بدلی تھی۔ ابھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ملبے سے اٹھنے والے دیو ہیکل جنگی جہازوں نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجائی تھی۔

یہ اس ساعتِ بے اماں سے بھی پہلے کی بات ہے جب نام نہاد اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی دھجیاں اڑا کر امریکہ اور انگلستان نے ہنستے بستے عراق کو ابھی کھنڈرات میں نہیں بدلا تھا۔

یہ اس عہد کی روداد ہے جب ابھی شام، ایران اور پاکستان کی دیواروں پر جنگی پرندوں کا خوف نہیں منڈلایا تھا۔

اس وقت راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

یہ ان دنوں کا قصۂ پارینہ ہے جب اہلِ مغرب بارود تیار کر رہے تھے اور مشرق کی دنیا پرفیوم کی خوشبو میں مدہوش اپنے آپ سے بیگانہ تعیش کی پگڈنڈی پر سرپٹ بھاگی جا رہی تھی۔ اسے یہ ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ پلٹ کر دیکھتی کہ مغرب پسِ پردہ کیا کر رہا ہے۔

افسانہ نگار تلاشِ روزگار میں کویت کی سلیٹی سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا۔

وہ گھر سے ملازمت کی تلاش میں صبح دم نکلتا۔ بلند و بالا عمارات کے سامنے اپنے آپ کو بونا محسوس کرتا، انہی بلند و بالا عمارات میں اسے اپنے حصے کا رزق تلاش کرنا تھا۔ وہ جب بڑی بڑی دیو قامت مارکیٹوں میں لمحے بھر کو رکتا تو اس کے دماغ کے خلیوں میں سوالات چیونٹیوں کی طرح ایک قطار باندھ کر چلنے لگتے۔ پہلے روز اس

نے ایک ساتھی سے پوچھا تھا

یہ سوق کے کیا معنی ہیں۔۔۔؟

مارکیٹ کو عربی میں سوق کہتے ہیں۔

جس سوق سے بھی اس کا گزر ہوتا وہ حیرت اور استعجاب سے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا۔ انسانی تعیش اور آرام کا وہ کون سا سامان تھا جو یہاں میسر نہیں تھا۔ مغرب نے سارا سامان عربوں میں انڈیل دیا تھا۔ اور ہر چیز کے عوض وہ اپنی معیشت کی بنیاد میں ایسی کنکریٹ ڈال رہے تھے جو ان کی آنے والی نسلوں کو بھی سنوار دے۔ کویت کا ہر شہری الف لیلوی دنیا میں رہتا تھا۔ وہاں کے عام شہری نے بھی اپنے گھر کو محل میں بدل لیا تھا۔

اونٹ قصہ پارینہ ہو کر صرف ''شمونے'' میں قیمے کے کام آتا تھا۔ وہاں نیرو چین کی بانسری بجاتا

تھا۔ تعیش ہی حاصلِ زیست تھا۔ ہفتہ وار تعطیل کے روز کویت کے ساحل خوبصورت اجسام کی مدہوش کردینے والے نسوانی خوشبو سے مہکتے تھے۔ عرب امراء دادِ عیش کے دل دادہ ساحل کنارے ایئر کنڈیشن خیموں میں نوخیز کلیوں کے جسم کے زاویوں میں کھوکر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ جسم کی خوشبو انہیں اس حد تک مدہوش کردیتی کہ وہ بھول ہی جاتے کہ کسی روز کوئی اور نامانوس خوشبو بھی ان کا مقدر ہو سکتی ہے۔

وہ تیل بیچتے اور آرام خریدتے تھے۔۔۔۔

زمین پر ہی انہوں نے جنت بسالی اور شداد کی جنت کا انجام بھول گئے۔۔۔۔!

افسانہ نگار سارا دن سڑکوں کی خاک چھانتا اور رزق تلاش کرتا تھا۔

وہ رزق کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے جب شاہراہوں سے گزرتا تو اس کے اندر موجود کیمرہ سارے عکس محفوظ کرتا چلا جاتا۔ وہ سوچتا یہ عکس کیوں محفوظ ہو رہے ہیں۔۔۔۔؟ یہ سڑے کنارے جو بڑے بڑے نارنجی رنگ کے ڈرم رکھے ہیں ان میں تو کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔ یہ عرب امراء کے محلات میں کام پر متعین خادمائیں کہیں بھولے سے تو ان میں روٹی، چاول اور سالن نہیں ڈال جاتیں۔

ایک دن اس نے جرات کر کے ایک خادمہ سے پوچھ ہی لیا یہ اتنا بہت سا سالن، روٹی اور چاول کا دیگچہ اس ڈرم میں الٹتے ہوئے تمہیں خوف نہیں آتا۔۔۔؟

یہ کام تو میں روز کرتی ہوں اس خادمہ کے ایک فقرے نے افسانہ نگار کو لرزا دیا'' وہ سوچ کی وادی میں جا اترا۔ کیا واقعی انسان گناہ کا عادی ہو جائے تو اس کی حسیات مر جاتی ہیں۔ قرآن کا کہا سچ ہے کہ ہم دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ آج اس نے مہر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی۔ وہ اپنے اندر بھی جھانک رہا تھا۔ کیا قطرہ قطرہ سیاہی دل کو اپنی لپیٹ میں تو نہیں لے چکی۔۔۔؟

اس نے جھرجھری لی۔۔۔

اسے اپنی دھرتی یاد آئی۔ اس کے سامنے اس کی دادی کا چہرہ ابھرا۔ اسے اس کی دادی نے روٹی کا ٹکڑا کھانے کے دوران ہاتھ سے گر جانے پر دوبارہ جھاڑ کر، چوم کر کھانا سکھایا تھا۔ دسترخوان پر روٹی کے باقی ماندہ ٹکڑے اور ریزے چیونٹیوں کے بل پر ڈالنے سکھائے تھے کہ یہ ان کا رزق تھا۔ بچی کھچی ہڈیاں ایک کونے میں ڈالنی سکھائی گئی تھیں جو گھر کی بلیوں کا حق تھا۔

یہ کام تو میں روز کرتی ہوں۔۔۔۔۔

خادمہ تو ایک علامت ہے۔ یہاں رزق کی بے حرمتی روز کا معمول ہے۔ ہائے یہ چاول کے دیگچے، یہ روٹیاں اور یہ گوشت کا عمدہ سالن۔۔۔ ہائے ہائے۔۔۔ اسے کیوں مٹی میں رول دیا۔ کہیں ترتیبِ وقت میں ایسا وقت نہ آ جائے کہ ساری قوم روٹی کے ایک لقمے کو ترستی قطار باندھے اپنی باری کا انتظار کھینچ رہی ہو۔ افسانہ نگار سوچتا اور کڑھتا رہا۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس وقت مغرب بارود تیار کر رہا تھا۔۔۔

اور عرب تیل بیچ کر پرفیوم خرید رہے تھے۔

خوشبو دونوں کی مدہوش کر دینے والی تھی۔ مغرب بارود کی خوشبو اور مشرق پرفیوم کی خوشبو میں مدہوش تھا۔

اہلِ مشرق اپنی خواب گاہیں مہکا کر سدھ بدھ کھو بیٹھتے اور پرفیوم کی مہین دیوار کے اس پار کا منظر ان کی نظروں سے اوجھل رہتا۔ ان کو یہ فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ خبر رکھتے کہ وقت کو کروٹ لینے میں کتنی دیر ہے۔

راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

آنے والا کل کس نے دیکھا ہے۔۔۔؟

افسانہ نگار بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ چکا تھا۔

اس نے بجلی کی ایک دکان پر اپنے آپ کو مصروف کر لیا۔ اسی وطن واپسی کے لئے زادِ راہ کی ضرورت تھی۔ اسے معمولی تنخواہ پر ملازمت مل گئی اور وہ اس پر ربِ کریم کا شکر گزار تھا۔ اس دکان پر ملازمین کی تعداد چار تھی۔ وہ اوزار تھامے سارا دن گاہک کا انتظار کھینچتے۔ جیسے ہی کوئی Complaint موصول ہوتی وہ اپنے اوزار تھامے کام پر نکل جاتے۔ ان کو گھر گھر جانے اور کام کرنے سے وہاں کے لوگوں کا بودوباش، طرزِ رہائش اور انداز واطوار کا تجربہ ہوتا۔ افسانہ نگار کو جب حساب کر کے مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ دی گئی تو وہ ربِ کریم کے سامنے سربہ سجود ہو گیا۔ گانٹھ لگے سلیپر ایک طرف رکھ کر اس نے نئے سلیپر خریدے۔ کپڑوں کا ایک جوڑا، قلم کاغذ اور دوسری اشیائے ضرورت کا سامان اپنے کمرے میں لا رکھا۔

اسے اس کے ساتھیوں نے محنت جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ ایک شاندار مستقبل سامنے کھڑا

ہے۔حالانکہ وہ کہیں بھی نہیں کھڑا تھا۔وہ یہ بات ماننے کا تیار ہی نہیں تھا۔جب وہ اس کے اندر نہیں کھڑا تھا تو وہ دوسروں کے کہنے پر کیسے مان لیتا۔

اس کے اندر ایک ہی خواہش بار بار سر ابھارتی کہ وہ اپنے وطن لوٹ جائے۔

کیا اپنی دھرتی پر یہ آسائشات میسر آجائیں گی۔۔۔۔؟ وہ سوچتا

ایر کنڈیشن کار، بجلی کی ایسی سہولت کہ موسم گرما میں ایر کنڈیشنر دن رات چلتا رہے۔اشیائے خوردونوش کی ایسی فراوانی کہ مہمان کی آمد بھی گراں نہ گزرے۔لیکن مجھے تو یہ سب نہیں چاہئے 'میں ایسا کیوں سوچ رہا ہوں۔۔؟

مجھے تو دو وقت کی روٹی چاہئے اور وہ میری دھرتی پر بہت ہے۔اس بنجر صحرا میں تو سایہ دار درخت دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔اس ریگزار میں تو تنہائی نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔یہاں دادی اماں اور نانی اماں کی بوڑھے برگد ایسی ٹھنڈی چھاؤں نہیں ہے۔میرے گاؤں میں تو شرینہہ کا درخت تھا اور یہاں بس کہیں دور صحرا میں جنگلی کیکر کی جھاڑیاں نظر آجاتی ہیں۔

مجھے سنجیدگی سے لوٹنے کا فیصلہ کرنا چاہئے۔۔۔

افسانہ نگار وطن واپسی کے لئے پائی پائی جوڑتا رہا۔

اور ہزاروں میل کی مسافت پر مغرب بارود جوڑتا رہا۔

اہلِ مشرق سامانِ تعیش جوڑتے رہے۔

افسانہ نگار ایک روز جب اس کی جیب میں وطن کو لوٹنے کا کرایہ تھا۔اس نے واپسی کی راہ لی۔

ابھی اس نے اسلام آباد ایر پورٹ پر زمین کو چوما ہی تھا کہ اسے اپنی پشت پر جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔وہ سمجھا جہاز نے رن وے پر اپنا رخ تبدیل کیا ہے۔لیکن وہاں تو کئی سال سرک چکے تھے اور وہ لاہور ایر پورٹ پر کھڑا تھا۔۔۔۔!

افسانہ نگار نے سوچا یہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے۔۔۔۔؟

میں ایک ہی جست میں یہاں کیسے پہنچ گیا ہوں۔۔؟

اس نے ایک شخص سے پوچھا بھائی یہ لاہور ایر پورٹ ہی ہے نا۔۔۔۔؟

"آہو۔۔۔جی۔۔!

لیکن آج اتنا زیادہ رش کیوں ہے۔۔۔؟ کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔

وہ جی عراق پر امریکی حملے کے بعد پاکستانی اپنے گھر آ رہے ہیں نا۔۔۔

افسانہ نگار نے اپنے آپ سے سوال کیا۔۔۔تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔۔؟

مجھے کیا معلوم میں کیا کر رہا ہوں۔

تم تو پہلے سے موجود ہو پھر پریشان کیوں ہو۔۔۔؟ کہیں اندر بہت گہرے اندر سے آواز آئی۔

یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔جانے کس دیس کو سدھار گئے۔سارے اہلِ دانش' سائینسدان' سیاست دان' علماء' سکالرز' حکمران اور سرفروش۔۔۔۔!

سب نے بہت دیر کر دیا ور ادھر عراق کے قصبے ناصریہ میں عرقی افواج کتنی دیر امریکی سیلابِ بلا کا مقابلہ کریں گی۔۔۔؟

افسانہ نگار ابھی کابل' قندھار اور قندوس کے بارے سوچ ہی رہا تھا۔

کہ اس کی سماعت سے جیوٹی وی کے عملے کی آواز ٹکرائی

کویت سے آئی ہوئی فلائیٹ سے اترتے مسافروں کو گھیر کر ان سے سوال کئے جا رہے تھے۔

جو وہاں کی سرزمین ہی چھوڑ آئے تھے۔۔۔وہ کیا خبر دیتے۔

وہ تو ایک ہی داستان سنا رہے تھے کہ جب ہمارا جہاز فضا میں بلند ہوا تو ایک ہی خوف تھا ہمیں ' کہیں کوئی امریکی میزائل ہمارے جہاز کو نہ آلے۔ان کو کیا خبر قندوس' قندھار' مزار شریف' کابل اور قلعہ جنگی جیسے ہولناک ترین واقعات کے بعد اب ناصریہ' بغداد' موصل اور کربلا پر کیا گزرنے والی ہے۔۔۔؟

وہ تو شانت تھے کہ انہوں نے جان کی امان پائی اور افسانہ نگار نے باہر نکل کر ائیر پورٹ کی تیز روشنیوں کے درمیان سے آسمان کو دیکھنے کی کوشش کی۔اس کی نگاہ ناکام پلٹ آئی۔

اچانک اسے ایک خیال آیا۔

اس نے اپنی جیب میں رکھے قلم کو غور سے دیکھا۔شاید اس میں اب روشنائی کی جگہ بارود ہو۔۔؟

اس نے قلم جیب سے نکال کر دیکھا۔

بارود تو اپنی جگہ قلم میں تو روشنائی بھی نہیں تھی۔

اس نے قلم جیب میں واپس رکھا۔ایک ٹھنڈی سانس لی۔

اس کا جسم تڑخا۔۔۔

اس نے فضا میں گہری سانس لی
بغداد میں امریکی ٹینک داخل ہوئے۔۔۔۔
اس نے قلم جیب سے نکال کر دیکھا۔
بارود تو اپنی جگہ، قلم میں روشنائی بھی نہیں تھی۔
اس نے قلم جیب میں واپس رکھا۔ایک ٹھنڈی سانس لی۔
اور اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔۔اور کہا
افسانہ نگار تم نے بہت دیر کر دی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

چائے کی پیالی

ارینہ نے اپنے من میں جلتی لالٹین کی لو نیچی کی۔
درد بڑھتا جا رہا تھا۔
ماضی کے سفر کی صعوبت سے وہ ہانپ گئی تھی۔
ابھی کل کی ہی تو بات ہے۔جب ارتات احمد نے اس کا گھونگٹ الٹا تھا تو اس کا کہنا تھا کہ تمہارے حسن نے میری آنکھیں خیرہ کر دی ہیں۔گھونگٹ الٹتے ہی اسے سکتہ ہو گیا تھا۔
اور وہ ساری باتیں بھول گیا تھا۔
شبِ عروسی میں اس کے پاس کہنے کے لیئے بہت کچھ تھا۔لیکن اس کے حسن کے سامنے اس کی زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔وہ بس ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ان دونوں کے درمیان بس خامشی زبان تھی۔وہ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتا کم تھا۔اس کی شریکِ سفر اعلی تعلیم یافتہ تھی۔آخری ڈگری اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے لی تھی۔

سسرال میں اسے سرآنکھوں پر بٹھایا گیا۔

گھر میں پہلے ہی کام کرنے والے ملازمین کی کون سی کمی تھی کہ اسے تو ارتات احمد نے مغلیہ عہد کی شہزادیوں کی طرح کئی کنیزیں رکھ دیں۔وہ کئی بار سوچتی۔

کیا یہ میرے ظاہری حسن کی پذیرائی ہے۔۔۔۔؟ ارتات احمد نے میرے اندر تو جھانکا ہوتا۔وہ میری سیرت کی پذیرائی کرتا تو مجھے اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوتی۔

اس گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔اس گھرانے کے خیالات بڑی حد تک باغیانہ تھے۔ان کے ہاں دولت ہر مسئلے کا حل تھی جب کہ اسی گھر میں اس کی نند اپاہج تھی۔پانی کی طرح پیسا بہایا گیا۔ لیکن اپاہج پن برقرار رہا۔

وہ جنت نظیر زندگی گزار رہی تھی۔

اس نے اپنے اخلاق سے سب کے دل جیت لئے تھے۔

اسے ایک گلہ تھا جس کی اس نے کبھی شکایت نہیں کی تھی حالاں کہ اسے یہ شکایت کرنی چاہیے تھی۔

اس کا خاوند کاروباری معاملات کی وجہ سے جب رات دیر سے گھر لوٹتا تو وہ اس کے انتظار میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی ہوتی تھی۔انتظار اس کے باطنی وجود کی چولیں ہلا کر رکھ دیتا۔۔لیکن زندگی کی آسائیشات کا سوچ کر وہ چپ ہو رہتی۔اسے یہ ادراک بھی تھا کہ اس کا خاوند اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔اسی پیار کی بدولت وہ اپنی اکلوتی اپاہج نند کے آرام اور علاج کا پورا خیال رکھتی۔

نند اس کی دوست تھی' ساتھی اور غم گسار۔۔۔!

ارتات کے آنے پر وہ اسے مسکرا کر کہتی لو۔۔۔۔ بھابھی۔۔۔۔ہمارے حصے کا وقت ختم ہوگیا۔

ایک دن زلزلہ آیا۔۔۔تو اپنی جان بچانے کے خوف سے اکیلے بھاگنے کی بجائے وہ نند کی کرسی بھی ساتھ گھسیٹ لائی۔لیکن اسی رات اس کے من میں آنے والے زلزلے کی شدت ریکٹر سکیل پر بہت زیادہ تھی۔اس کے اندر کی عمارت زمین بوس تو نہیں ہوئی لیکن دراڑوں نے عمارت کو کمزور کر دیا۔

اس کے خاوند نے غیر متوقع طور پر اس کے اعتماد کی چادر کو کونا پکڑ کر یوں کھینچا کہ وہ لرز گئی۔

ایک خیال مجھے پریشان کرتا رہتا ہے۔۔۔

خیریت ہے۔۔۔۔؟ کیسا خیال۔۔۔۔؟

تم ناراض ہو جاؤ گی۔

میں اور آپ سے ناراض۔۔۔۔!اگر خواب میں بھی آپ نے یہ منظر دیکھا تو معاف نہیں کرونگی۔

میرے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔

اولاد نہ ہونے کی وجہ سے تو آپ پریشان نہیں

نہیں یہ بات نہیں۔۔۔۔

بات یہی ہوگی۔رپورٹ آجانے سے آپ پریشان ہیں تو کھل کر کہیں۔اگر میں اولاد پیدا نہیں کر سکتی تو پروین شاکر کی طرح کمال ضبط کو آزما کر آپ کی دلہن اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گی۔اگر آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو میں ساری عمر آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔

تم بات کو کہاں سے کہاں لے گئی ہو تو پھر مسئلہ کیا ہے۔۔۔۔؟

میرے اندر زہر پھیل گیا ہے۔

وہ یوں تڑپی جیسے اسے کسی صحرائی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

بات کھل کر کہیں۔۔۔۔۔وہ پلنگ پر بیٹھی تھی اور اس کی زلفیں پریشاں تھیں۔

میرے اندر شک کا زہر پھیل گیا ہے۔

میں آپ کی ان الجھی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہی۔آپ کہہ کیا رہے ہیں۔۔۔۔۔؟

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے کردار پر شک کرنے کی بجائے تمہارے ساتھ کھل کر بات کی جائے۔اگر تم جھوٹ نہیں بولو گی تو بات یہیں دفن ہو جائے گی۔

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔۔۔۔خزاں رسیدہ پتے کی طرح۔۔۔۔!

اس کا تن من اجلا تھا۔بے داغ۔۔۔۔کہیں کوئی خراش نہیں تھی۔پھر بھی جانے اس کے مجازی خدا نے اس پر کیوں شک کیا تھا۔اس نے اپنے آپ کو جمع کیا۔وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔انسان کے وجود کے ٹکڑے بکھر جائیں تو انہیں سمیٹنا مشکل ہوتا ہے۔اس نے اپنے وجود کے ریزے جمع کئے۔اس نے حواس کو مجتمع کیا۔اس کی زندگی بکھرنے لگی تھی۔جانے شک کی چنگاری اس کے مجازی خدا کے من میں کہاں سے آ گری تھی۔غصے اور جذبات کی رو میں بہنے کا وقت نہیں تھا۔اس نے پورے اعتماد سے سوال کیا۔

میں شک کی وجہ جان سکتی ہوں۔۔۔۔؟

تمہارے بے پناہ حسن نے مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔
اس میں میرا کوئی قصور نہیں نکلتا۔
کیسے۔۔۔؟
میں نے اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا۔ یہ تخلیق کار کی عنایت ہے۔
ایک بات کہوں۔۔۔۔
کہیے۔۔۔۔
سکول، کالج اور یونیورسٹی میں تمہارا کوئی دوست بھی رہا ہے۔۔۔؟
دوست سے آپ کی مراد ہے۔۔۔اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔
کوئی ایسا شخص جس نے تمہیں پسند کیا ہو۔۔۔؟
پسند کرنے والے تو ہزاروں تھے۔شمع کے گرد پروانے تو رقص کرتے ہی ہیں۔
تم کچھ چھپا رہی ہو۔
میں کچھ بھی نہیں چھپا رہی۔آپ نے سوال ہی الٹ کیا ہے۔ میں ہزاروں کی پسند سہی۔لیکن میں نے کسی کو پسند نہیں کیا۔ میری زندگی میں آپ پہلے مرد ہیں۔
میں کیسے یقین کر لوں۔۔۔؟
بے یقین زندگی آپ کو ذہنی عذاب میں مبتلا کر دے گی۔ میں آپ کی ہوں۔ مجھ پر یقین کیجئے۔ یہ یقین اسٹامپ پیپر پر لکھ کر نہیں دیا جا سکتا۔ دل کے اسٹامپ پیپر کسی عدالت سے نہیں ملتے۔ میں اپنی عدالت میں بے گناہ ہوں۔تم اپنی عدالت سے فیصلہ لو۔ مشکلات کی ہوا چل پڑی تو یقین کے خیمے اکھڑنے سے ہم عمر بھر کے لئے بے سائبان ہو جائیں گے۔
اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔
وہ بے یقینی کی پگڈنڈی پر ننگے پاؤں بھاگ رہا تھا۔
اس کی من کی سلگن اس کے لئے سوہانِ روح بن چکی تھی۔
گھر میں سرد مہری کے کاکروچ نکل آئے۔ ان کا سدِ باب کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔
ارینہ کے اندر ایک روز انتقام کے ناگ نے پھن پھیلایا۔ اس نے قوتِ ارادی کے منتر سے اسے رام کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر یہ ناگ پھن پھیلائے اپنا کام کر گیا تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔

وہ مسمار ہوتی چلی گئی۔
اسے اپنے آپ کو تعمیر کرنا تھا۔ لیکن اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔
اس نے تمام حربے آزما ڈالے۔
اس کی روح اس کے جسم سے نکل چکی تھی۔ وہ بس ایک ڈھانچا تھی۔ ایک پنجر۔۔۔!
اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا وہ سانس کیسے لے رہی ہے۔
وہ تیمور کی چیونٹی تھی۔
وہ اپنے شریکِ سفر کے تعمیر شدہ شک کے کنویں میں سے نکلنے کی سعی کرتی رہی۔
وہ کنارے تک پہنچتی لیکن خاوند کی کائی زدہ گفتگو اسے پھر پاتال میں دھکیل دیتی۔
اسی کوشش میں ایک دن ایک خیال اس کے اندر کوندے کی طرح چمکا۔
وہ چونکی اور یوں مسکرائی جیسے اچانک اندھیرے میں کوئی جگنو چمکے۔
اسے زندہ رہنے کو کنارا ہاتھ آ گیا۔
وہ خوشی سے چیخنا چاہتی تھی۔ لیکن اس ڈر سے کہ اسے پاگل نہ سمجھ لیا جائے وہ ضبط کر گئی۔
اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ کمرے میں ٹہلتی اور گنگناتی رہی۔ سارے منظر بدل گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔
جب اس نے نند کے سامنے کھانا لا رکھا تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔
یہ تم ہو۔۔۔۔۔؟
ہاں۔۔۔ میں ہوں۔ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔
یہ تبدیلی کیسے۔۔۔۔؟
مجھے وہ مل گیا ہے۔
کون مل گیا ہے۔۔۔۔؟
جس کی تلاش میں صدیوں سے میری روح بھٹک رہی تھی۔
میرے بھائی کے علاوہ بھی کوئی ہے۔۔۔۔
ہاں ہے۔
عقل کے ناخن لو۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔۔۔؟

اگر تم راز دار رہنے کا وعدہ کرو تو میں تم کو وہ راز بتا سکتی ہوں

اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

عورت کے فطری جذبۂ تجسس سے مجبور ہو کر اس نے وعدہ کر لیا۔

میں نے اپنے اندر ایک تخیل تعمیر کیا ہے۔ ایک وجیہہ شخص کا تخیل۔۔۔! بالکل ایسے جیسے فرانسیسی ناول نگار پیرالوئی کے عظیم الشان ناول افروڈائیٹ کا مرکزی کردار۔۔۔۔! جب وہ مجھے چھوتا ہے تو میرے پورے وجود میں موسیقی کی لہریں اٹھتی ہیں۔ میرا پورا جسم موسیقی کے آلات میں بدل جاتا ہے۔ جب وہ میری زلفوں کے تار پر کوئی راگ چھیڑتا ہے تو میں دنیا و مافیہا سے کٹ جاتی ہوں۔ میرے ہونٹوں کے پیانو پر اس کی انگلیاں نئے اور الوہی سروں کو جنم دیتی ہیں۔ میری آنکھوں کے بربط پر اس کا لمس راگ درباری میں بدل جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے بانہوں میں اٹھا لے تو مجھے یوں لگتا ہے میں الن فقیر کا اکتارہ ہوں جسے وہ بے خود ہو کر بجا رہا ہے۔ میں میں نہیں رہتی تم ہو جاتی ہوں۔ میں اس کی آواز پر چونک اٹھتی ہوں۔ وہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ میں اس کی دیوداسی ہوں۔

اس دن دوپہر کے کھانے پر اس کا خاوند آیا تو وہ کھانے کی میز پر نہیں تھی۔

ارینہ کہاں ہے۔۔۔؟

اس کی طبیعت خراب ہے۔

وہ بیڈروم میں داخل ہوا تو وہ کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ اس نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

اگلی صبح وہ ناشتے پر بھی نہیں تھی۔ استفسار پر اس نے ناسازِ طبیعت کا بہانہ کیا۔ آنے والے دنوں میں اس نے محسوس کیا کہ ارینہ اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ حالاں کہ یہ خلیج اس کی اپنی پیدا کردہ تھی۔ اس کی طبیعت میں جھلاہٹ آنے لگی۔

تم کس دنیا میں رہتی ہو۔۔۔؟

اپنی دنیا میں رہتی ہوں۔

کون سی دنیا ہے تمہاری۔۔۔۔؟

تمہیں اس سے کیا۔۔۔!

تم ہر وقت بنی سنوری کیوں رہتی ہو۔۔۔۔؟

میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔۔۔۔!

تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تم میری بیوی ہو۔

شاید۔۔۔۔۔!

وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

ارینہ اس سے دور ہوتی چلی گئی۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ ساحل پر کھڑا ہے اور سامنے سمندر میں اس کا مال بردار جہاز آہستہ آہستہ ڈوب رہا ہے۔ وہ اسے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن سمندر پر شور تھا۔

اس نے ارینہ کو کسی ماہرِ نفسیات کو دکھانے کا فیصلہ کیا۔

ڈاکٹر سے اپوائنٹمنٹ لے کر جب وہ گھر پہنچا۔ تو ارینہ کسی انگریزی ناول میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

شیشے کی میز پر رکھی چائے شاید ٹھنڈی ہو گئی تھی

ارینہ۔۔۔۔؟

گہری خاموشی تھی۔۔۔۔

اس نے دوبارہ پکارا۔۔۔۔ ارینہ ناول میں اتنا استغراق۔۔۔۔۔۔۔!

اسے اس کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی

ارینہ۔۔۔۔ ارینہ

اس نے ناول بند کیا اور پوچھا

یہ آپ کس کو پکار رہے ہیں۔۔۔۔۔۔؟

تمہیں۔۔۔

لیکن معاف کیجیئے میں تو۔۔۔۔ ارینہ نہیں ہوں۔۔۔۔ ! آپ کون ہیں اور کس سے ملنا ہے آپ کو۔۔۔۔؟

ارینہ۔۔۔۔!

یہ آپ کے لئے کوئی چائے رکھ گیا ہے۔ پی لیجئے

اس نے ارینہ کی آنکھوں میں جھانکا تو آنکھوں میں رکھی اس کے حصے کی چائے کی پیالی جانے کب

سے ٹھنڈی ہو چکی تھ

☆☆☆

دہاڑی

خزاں اور بہار کی درمیانی رت تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے خزاں رسیدہ پتے درختوں سے ٹوٹ کر میرے اردگرد سر پٹخ رہے تھے۔ شیشم کی اونچی شاخ پر ایک پرندہ چونچ میں دانہ لئے آیا۔ خزاں رسیدہ درخت کی ننگی ٹہنیوں پر وہی ایک گھونسلہ بہار کی علامت تھا۔ اس میں زندگی اور بہار کے آثار تھے۔ لان کے اطراف میں لگے اکا دکا کیلی کے پودوں پر سرخ اور پیلے پھول کھلے تھے۔ میں ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح رسالے کے اوراق بھی پھڑ پھڑا رہے تھے اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں یا سوچ رہا ہوں۔ شاید میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔۔۔ میں کچھ نہ کچھ تو کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں تحریروں کا ایک جال بچھا تھا، پرندے بول رہے تھے اور میں سلیمان نہ تھا کہ ان کی بولی سمجھ لیتا۔ وہ یقینی طور پر ایک دوسرے کو اپنی کتھا سنا رہے تھے۔ بان کی کھردری چارپائی کی پائنتی رکھی ٹرے میں چائے کی پیالی سرد ہو گئی تھی۔ میری خواہش تھی کہ جیسے ہی کسی پرندے کی چونچ سے کوئی کہانی گرے،

میں اسے اٹھا کر سنبھال لوں اور مکمل کر کے کسی جریدے میں اشاعت کے لئے بھیج دوں۔لیکن خیال آیا۔۔۔۔۔ یہ شوقِ ناموری کس لئے۔۔۔۔۔؟ کسی پرندے کی چونچ سے گری ہوئی کہانی تو میری اپنی سوغات ہے، میں اسے عام کیوں کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایسی کہانیاں سنبھال کر کیوں نہیں رکھتا۔کیا یہ تحریریں بھی کسی کی امانت ہیں؟ جو ہمیں لوٹانی ہیں۔تخلیق کار کو معلوم ہی کب ہوتا ہے کہ سہ کس لئے تخلیق گری کے عمل سے گذر رہا ہے؟ اپنی ذات کی تشہیر کے لئے؟ معاشرے یا پھر کائنات کے لئے۔۔۔۔۔؟ میرے آنگن میں کوئی پنجرہ نہیں۔۔۔۔ میں نے پرندے کبھی قید نہیں کئے۔بچپن میں چھین کے طوطے جو پیغام لائے تھے وہ میں آج تک نہیں بھولا۔ مجھے قید سے نفرت ہے۔۔۔۔ قید جبر کی علامت ہے، پرندے اور کہانیاں قید نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ قید ہو جائیں تو فضا میں گھٹن بڑھ جاتی ہے جس سے دم رکنے لگتا ہے۔ میں گھر کے آنگن میں مٹھی بھر باجرہ بکھیر دیتا ہوں، پرندے دانا چگتے، چہچہاتے اور مجھے کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔کہانی تلاش کرنے کے لئے میں اٹھا، اندر سے باجرہ نکال کر صحن میں بکھیر دیا۔تھوڑی دیر میں چڑیاں، لالیاں، کال کھڑچی، کوے اور ہدہد میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ابھی وہ دانہ چگ ہی رہے تھے کہ ایک دم اڈاری مار کر اڑ گئے۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔۔۔۔ سامنے پگڈنڈی پر ایک شخص آرہا تھا۔۔۔ دھیمی چال چلتا ہو۔۔۔۔ آہستہ آہستہ اس کے نقوش واضح ہونے لگے۔اس کے پاؤں میں گانٹھ لگی چپل، سر پر بوسیدہ میلی سی پگڑی اور بغل میں خالی بوریاں تھیں۔ پرندوں کی جگہ چارپائی پر وہ آ کر بیٹھ گیا۔کہانیاں پرندے اپنے ساتھ لے اڑے اور میں رسالے کے اوراق میں سے پرندے تلاش کرنے لگا۔خزاں کی خامشی میں اک آواز ابھری "چار چار روپے۔۔۔۔ سستیاں لے لو۔۔۔۔ چار چار روپے" میرا جی چاہا اٹھ کر ایک چنگیر لے لوں۔ممکن ہے چنگیر میں روٹی کی بجائے کوئی کہانی رکھی ہو۔اور بیچنے والی کی جیب میں رقم کی بجائے بھوک رکھی ہو۔۔۔۔ وہ خزاں رسیدہ چہرے والی ایک پستہ قد عورت تھی۔اس کے کپڑوں میں جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔وہ گذر گئی۔۔ میں چنگیر سے کہانی اٹھا سکا نہ اس کی جیب سے بھوک۔۔۔ دیر تلک اس کی پشت پر لٹکتے چھولے اور سر پر دھری چنگیروں کو دیکھتا رہا، رسالے کے اوراق چپ ہو گئے۔۔۔۔ گونگے اور بہرے۔۔۔۔۔ان کی قوت گویائی کیا ہوئی۔۔۔؟ ان سے نطق کس نے چھین لی۔۔۔۔؟ یہ آدمی جو میرے سامنے بیٹھا ہے کون ہے؟ کہاں سے آیا

ہے؟ ہم سب کہاں سے آئے ہیں۔۔۔؟ ہمیں جانا کہاں ہے۔۔۔ہمارے سروں پر رکھی چنگیروں میں کیا ہے؟ روٹی یا بھوک۔۔۔؟ کائنات کی اصل کیا ہے۔۔۔؟ شکم سیری یا فاقہ کشی۔۔۔؟ ہماری چنگیروں میں سے بھوک کہاں اڑ گئی ہے؟ قناعت کے سکے ہم کہاں گرا آئے ہیں؟ انہیں تلاش تو کرنا چاہیئے، شاید گم شدہ میراث مل جائے۔۔۔! اس آدمی کو یہ بوریاں کھول کر ساری کہانیاں مجھے دے دینی چاہئیں، لیکن میں اسے کیا دوں گا۔۔۔ بھوک۔۔۔یا روٹی۔۔۔؟ اگر یہ ضرورت مند ہوا تو میرے پاس اسے دینے کے کیا ہے؟ کہانیاں۔۔۔؟ کہانیوں سے پیٹ تو نہیں بھرتا، چولہا تو نہیں جلتا۔۔۔ افلاس کا تن تو نہیں ڈھانپا جا سکتا۔۔۔! اجنبی شخص نے چارپائی ایک طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ درخت کے نیچے نہیں بیٹھنا، پرندوں کی بیٹ گرے گی۔۔۔۔ میں بے روح اوراق پلٹتا رہا۔۔۔ میرے سامنے بیٹھے شخص کی خواہش تھی کہ میں اس سے باتیں کروں، لیکن کون سی۔۔۔؟ حالات حاضرہ، موسم، مہنگائی، بیروزگاری، علاقائی سیاست، جنگ، امن، ایٹم۔۔۔کون سی بات۔۔۔۔۔؟ وہ آہستہ سے کھنکارا، گلہ صاف کیا، پگڑی سنبھالی، بوریوں کو تھپتھپایا حالانکہ وہ خالی تھیں۔ ان میں اناج بھرنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ آپ کیسے ہو۔۔۔؟ وہ گویا ہوا۔ ٹھیک ہوں۔۔۔ الحمدللہ۔ شہر سے کب آئے ہیں؟ کل ہی۔۔۔ میاں صاحب کے قاتل کا پتہ چلا۔۔۔۔نہیں۔۔۔! ہائے ہائے کیسے سفاک لوگ تھے، موٹر سائیکل چھین لے جاتے، انہیں گولی تو نہ مارتے۔ موٹر سائیکل بھی گئی، جان بھی گئی۔۔۔خان صاحب۔۔۔ آپ کا میاں صاحب سے تعارف کیسے ہے؟ اجی۔۔۔ہم ان کے ٹریکٹر پر مزدوری کرتا تھا، مٹی ڈھونے کا کام کرتا تھا، میاں صاحب بہت اچھا انسان تھا، موٹر سائیکل چھیننے والوں کو کیڑے پڑیں، ان کی لاشیں گل سڑ جائیں۔۔۔۔ خان جی، آج کیسے آنکلے۔۔۔؟ "نقش" لینے آیا ہے جی۔۔۔ بیوی کا دودھ سوکھ گیا ہے اور بچہ بیمار ہے، ہاتھ بہت تنگ ہے، اپ تو کہیں مزدوری بھی نہیں مل رہا ہے۔ میں خان صاحب کے کھردرے اور سخت ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ بیلچے نے اتنی روٹی نہیں کمائی تھی، جتنی ہاتھوں نے گانٹھیں کما لی تھیں۔ کھردرے ہاتھوں پر محنت کی روٹی رقم تھی، لکیروں کی لکڑیاں ہاتھ کے تندور میں سلگ رہی تھیں، لیکن بوریاں خالی تھیں، وہ پرامید تھا کہ بوریاں بھر جائیں گی۔ "نقش" سے دودھ اتر آئے گا اور اس کا بچہ کلکاریاں مارنے لگے گا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔۔۔وہ

مسکرایا اور کہا، میاں صاحب۔۔۔۔ایک عرض کروں۔۔۔اگر آپ کو برا نہ لگے تو۔۔۔؟ کہو، کہو خان صاحب۔۔۔وہ جی۔۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔۔میری۔۔۔۔میاں صاحب کی طرف ایک دیہاڑی نکلتی تھی جی۔۔۔۔ساٹھ روپیہ۔۔۔۔!بڑے میاں جی سے آپ کہیئے ناں۔۔۔کہ نقش کے ساتھ اگر ساٹھ روپیہ بھی مل جائے، تو۔۔۔؟ اچھا۔۔۔!میں اٹھ کر اندر گیا۔۔۔میاں جی نے کھاتہ کھولا، اسے کھنگالا۔۔۔خان صاحب کی دیہاڑی کہیں رقم نہیں تھی، دیہاڑی کی بجائے وہ نقش لے کر باہر آئے۔اچانک ان کے ہاتھ سے "نقش" چھوٹ کر گر گیا۔۔۔خزاں رسیدہ درخت پر سے کوا اترا، روزی کا لقمہ سمجھ کر اسے چونچ میں دبایا اور اڑ گیا۔

☆☆☆

مے خوار

پینتیس برس کی عمر میں اُسے کہولت نے آلیا۔اس کے کندھوں کی ہڈیاں اونٹ کی کوہان کی مانند ابھر آئیں اور وہ قدرے جھک کر چلنے لگا گویا کسی پہاڑی سے اُتر رہا ہو۔اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پہلے سلیٹی اور پھر سیاہی مائل ہو گئے۔وہ پہروں اپنے دل کے مے خانے میں بیٹھ کر جانے کون سی مے کے جام انڈیلتا۔کسی کو کیا معلوم۔۔۔۔؟

لوگ کہتے اسے شراب نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی جا کر اس سے معلوم کرتا کہ وہ شراب کا رسیا کیوں ہو گیا۔اس کے گناہ کے ساتھ ساتھ لوگ اس کے وجود سے بھی نفرت کرنے لگے۔وہ پہروں سوچتا، گنہ گار ہونا الگ بات ہے اور وجود کی اپنی ایک الگ شناخت ہے۔لوگ میری مے نوشی سے بھلے نفرت کریں لیکن میرے ساتھ

تو محبت آمیز رویہ روا رکھیں۔ میری دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے میں نے کوئی ایسا جرم کیا ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔ شراب ہی تو پیتا ہوں، کبھی کسی کو گالی نہیں دی، غیبت نہیں کی، کسی کی پگڑی نہیں اچھالی، دھوکا نہیں کیا، ملاوٹ نہیں کی۔ حالاں کہ مجھے تو شراب بھی خالص نہیں ملتی۔ شاید اسی لیے میں نے کبھی نشے میں مست ہو کر بدمستی نہیں کی۔ لیکن مجھے اس شہر میں جینے کا حق کیوں نہیں دیا جا رہا؟ اتنے بہت سے لوگوں کو یہ حق کون بخش دیتا ہے کہ وہ ہر کسی کے کردار پر انگلیاں اٹھاتے پھریں۔ اپنے گھر اور گریبان میں وہ نہیں جھانکتے، بس بھرے شہر میں ایک میں ہی رہ گیا ہوں جسے رُسوا کرنے کو چن لیا گیا ہے۔ مسجد میں نماز ادا کرنے کو جاؤں تو لوگ چہ مگوئیاں کرتے ہیں، اللہ کے گھر میں بیٹھ کر مُردار بھائی کا گوشت کھاتے ہیں۔ کیا اللہ کے گھر صرف نیکوکاروں کے لیے ہیں، گنہ گار کوئی الگ گھر جا بسائیں۔ وہ کس مصلے پر سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔

بات تو اتنی سی تھی، نا۔۔۔۔۔ کہ میں نے ایک امام مسجد کی جائے نماز صحن میں بچھا کر نماز پڑھ لی۔ دوسرے روز جائے نماز بدل دی گئی۔ مجھ سے تو وہ بدّو اچھا تھا جس نے مسجد کے صحن میں پیشاب کر دیا تھا۔ مسجد دھو کر اسے پیار سے سمجھا دیا گیا۔ کوئی تو مجھے بھی سمجھاتا، کوئی ایک شخص۔۔۔۔۔ سینکڑوں سجدہ ریز نمازیوں میں سے کوئی ایک۔۔۔۔۔! وہ شکر ہے، اللہ میاں نے مجھے خود ہی کہہ دیا۔

لا تقربو الصلوٰۃ الّا انتم سکارا o تو میں۔۔۔۔۔ ہاں میں۔۔۔۔۔ سکارا کی حالت میں، نشے کی حالت میں تو مسجد نہیں جاتا۔ میں تو جب اپنے حواس میں ہوتا ہوں تو اللہ کے گھر جاتا ہوں۔ جانے لوگ اپنے قلوب میں نفرت کی آبیاری کیسے کر لیتے ہیں۔ میرے قریبی دوست بھی سمجھتے ہیں کہ میں موقع پرست ہوں، حالاں کہ میں نے کسی سے شراب کے لیے پیسے نہیں مانگے۔ میں اپنی زندگی کی ناؤ خود ہی وقت کے پانیوں میں کھینچتا پھر رہا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم، ساحل میرا مقدر ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔؟ ساحل کا تو کسی کو معلوم نہیں ہوتا، پھر بھی لوگ عارضی کشتیوں میں مستقل گھر بنا لیتے ہیں۔ بھلا پانی میں گھر بنانا کہاں کی عقل مندی ہے۔؟

سارا بازار مجھ سے نالاں ہے کہ میں عصر کے بعد پٹھانے خان کی کیسٹ اونچی آواز میں کیوں لگا لیتا ہوں۔ ہر کام میں مین میخ نکالنا ان کا مشغلہ ہو گیا ہے۔ بھلے سے اپنی دکانوں میں

پردے کے پیچھے جو مرضی کرتے رہیں۔ اس ایک مہینے میں کتنے واقعات نمودار اور روپوش ہو گئے۔ کپڑے والا بھری دوپہر میں پردے کے پیچھے ایک عورت کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ جانے کتنی عورتوں کو مفت کپڑے پہناتے پہناتے ان کے کپڑے اُتار لیے۔ اور تو اور سنار نے سونے کی انگوٹھی کے عوض ایک کنواری لڑکی عزت کا سونا اتار کر اسے ذلت کی کٹھالی میں ڈال دیا۔ جنرل سٹور والے کو دیکھو، سرخی پاؤڈر اور پرفیوم دکھاتے دکھاتے کتنی عورتوں کے ساتھ شرمناک کھیل کھیلتا رہا۔ جو بھی پردہ نشین آتی ہے پردہ کھینچ لیتا ہے، کہتا ہے، بی بی کیا کیا دکھاؤں۔ چیزوں کے دام چکاتے چکاتے سارے سالے عزت کے دام چکاتے لیتے ہیں اور میں۔۔۔۔۔

میں تو بس ذرا سی پی لیتا ہوں۔ میں بھی اسی بازار کا حصہ ہوں، میں نے تو اپنی دکان پر آنے والیوں سے کبھی اپنا حصہ نہیں مانگا۔ یہ سالے کہتے ہیں عورتون کو ہم نہیں پھنساتے۔۔۔۔۔ خود بخود پھنس جاتی ہیں۔ جھوٹ بکتے ہیں سارے۔۔۔۔۔ جال پھیلا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ عورتوں کو ایسے پھانستے ہیں جیسے بچپن میں بچے ٹوکرا لگا کر دور کہیں چھپ جاتے ہیں اور جیسے ہی چڑیاں ٹوکرے کے نیچے بچھے دانے چگنے آتی ہیں، وہ رسی کھینچ لیتے ہیں اور چڑیاں ٹوکرے تلے پھنس جاتی ہیں۔۔۔۔۔ اس میں چڑیوں کا کیا قصور ہے؟ خوب صورت چیز اور دانہ دنکا دیکھ کر پھنسنا ان بے چاریوں کی جبلت میں ہے۔ یہ سارے دکان دار جو مجھے اس بازار سے نکالنے پر تلے بیٹھے ہیں، یہ عورتوں کو انہی چڑیوں کی طرح پھانستے ہیں، پھر بھون کر کھا جاتے ہیں۔ یہ دکانیں نہیں ٹوکرے ہیں۔۔۔۔۔ ٹوکرے۔۔۔۔۔!

اس سے پہلے کہ یہ مجھے بازار بدر کر دیں، شہر بدر کر دیں، میں خود ہی کسی اور نگر کو کیوں نہ نکل جاؤں؟ جہاں کہیں دانہ پانی لکھا ہوگا، ڈیرہ ڈال لوں گا۔۔۔۔۔ لیکن وہاں بھی تو بازار ہوں گے۔ ٹوکرے۔۔۔۔۔ اور چڑیاں۔ تو کہاں جایا جائے۔ یہیں جم کر ان کا مقابلہ کیا جائے یا۔۔۔۔۔؟ لیکن جم کر مقابلہ کیسے کیا جائے۔۔۔۔۔؟

ابھی گزشتہ ہفتے کی بات ہے میں نے ایک بیوہ عورت کو علاج کے لیے ہزار روپیہ دیا اور دو دن شراب نہیں پی سکا۔ میری شراب نہ پینے کی بات تو میری بیوی تک نہ پہنچ سکی البتہ دیا سلائی کوئی میرے آنگن میں پھینک آیا کہ میں نے ایک خوبرو بیوہ کو ہزار روپیہ دیا ہے۔ وہ

تو اللہ خوش رکھے میری رفیقِ سفر کو، وہ کم سے کم میرے کردار پر شک نہیں کرتی۔ شاید یہ نماز کی برکت ہے۔۔۔۔۔

لوگ اس بات کا یقین کیوں نہیں کرتے کہ شراب بے شک بری ہی سہی، لیکن مجھے غموں سے پل بھر کو نجات مل جاتی ہے۔ مجھے یہ خبر تو نہیں ہوتی نا کہ میرے بچے بھوکے ہیں۔۔۔۔۔ میری بیوی کے پاؤں میں چپل نہیں ہے، میں نے سبزی اور گوشت والے کا ادھار چکانا ہے۔ منیاری والا اگلے مہینے ادھار سودا سلف دے گا کہ نہیں؟ بجلی کا بل جمع کرانے کی آخری تاریخ کون سی ہے؟ کتنے بہت سے غموں سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔۔۔۔۔

لیکن اب اس شہر میں رہنا محال ہے؟ یہاں صرف شریف لوگ رہتے ہیں۔ میرے جیسے بدکردار اور اوباش لوگوں سے اس شہر کا ماحول برباد ہو جائے گا۔ مجھے یہاں سے نقل مکانی کر لینی چاہیئے۔ شاید میرے دوست ٹھیک ہی کہتے ہیں، مجھے شراب ہی لے ڈوبی ہے، لیکن مجھ سے کبھی کسی نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے اس انگور کی بیٹی سے راہ و رسم بڑھائی کیوں۔۔۔۔۔؟ شاید مجھے خود بھی معلوم نہیں۔۔۔۔۔؟ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نئے شہر میں جاؤں گا، نئے لوگ ہوں گے، بھلے سے وہاں بازار میں ٹوکرے اور چڑیاں ہوں، لیکن میں شراب چھوڑ دوں گا۔ کسی سے راہ و رسم نہیں بڑھاؤں گا۔ بس اپنے کام سے کام رکھوں گا۔۔۔۔۔ بازار سے گھر اور گھر سے مسجد۔۔۔۔۔ شاید اس طرح زندگی کا دھارا بدل جائے۔ لوگوں کی طعن و تشنیع کے کمان سے نکلنے والے زہر میں بجھے تیروں سے۔

اس نے عمرِ رفتہ کا حساب جوڑا اور عمرِ رواں کے سمندر میں اپنی ناؤ ڈال دی۔ نئے شہر میں اجنبی لوگوں کے درمیان جیتے جیتے اس کے کندھوں کی ہڈیاں کچھ اور نمایاں ہو گئیں۔ اس کے بچے جوان ہو گئے۔ وہ سمجھا اس نے زندگی کا سراغ پالیا ہے۔ اس نے جو سوچا تھا، جیسے زندگی گزارنے کا اپنا ایک ڈھنگ بنایا تھا، زندگی اسی طرح گزرنے اور گزارنے لگا۔ وہ نمازِ فجر کے بعد آدھ گھنٹہ تلاوت کا معمول پورا کرتا۔ دو کلومیٹر کی سیر کر کے لوٹتا، ناشتہ کرتا اور اللہ کا نام لے کر دکان کھولتا۔ اس کے چہرے پر نور ہی نور تھا۔ وہ مسجد باقاعدگی سے جاتا۔ بازار کا وہی معمول تھا جو وہ پچھلے شہر میں چھوڑ آیا تھا۔ دکان میں پردہ اس نے نہیں لٹکایا تھا۔ کیوں کہ اسے پسِ پردہ ہونے والے کھیل سے خوف آتا تھا۔ اس نے کبھی کسی پر رائے زنی نہیں کی۔ اس روز بھی اس نے حسبِ معمول

دکان کھولی۔۔۔۔۔

دن بھر گاہک آتے رہے۔۔۔۔۔خریداری کی رونق چلتی رہی۔

شام ڈھلے وہ دکان بند کر رہا تھا کہ ایک گاڑی آ کر رکی۔۔۔۔۔

اس نے کہا، بی بی نماز کا وقت ہے، کل آیئے گا۔۔۔۔۔

بابا جی۔۔۔۔۔! مجھے اپنے Husband کی برتھ ڈے کے لیے ابھی خریداری کرنی ہے۔

آواز سن کر وہ چونکا۔۔۔۔۔

کپکپاتے ہاتھوں سے دکان کا دروازہ کھولا۔۔۔۔۔

اور دل کے مے خانے میں بیٹھ کر پرانی یادوں کے جام انڈیلنے لگا۔۔۔۔۔!

☆☆☆

جرابوں کی تدفین

آئینے میں احسن نے اپنے خدوخال کو چھو کر دیکھا۔ اس کے نقوش آہستہ آہستہ معدوم ہوتے چلے گئے اور آئینے میں کوئی اور اسے حیرانی سے تکتا نظر آیا۔ منظر بدل گیا اور وہ بدلتے منظر کے نظارے میں کھو گیا۔ احسن کی عمر ہی کیا تھی۔۔۔۔۔اٹھارہ سال۔۔۔۔۔اس نے اپنے خدوخال کو پھر چھو کر دیکھا۔۔۔۔۔اور رؤف امیر کا شعر گنگنایا۔

یہ آئینہ مجھے کس رُخ پڑا نظر آیا
میں اپنی عمر سے کتنا بڑا نظر آیا

وہ سوچنے لگا۔۔۔۔۔مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔؟ یہ میں ہوں یا کوئی اور؟ محبت تو تقویت

کی علامت ہے لیکن مجھے کیوں دیمک چاٹ رہی ہے؟ لوگ جانے کیسے جی لیتے ہیں؟ وہ باہر لان میں نکل آیا، پھولوں اور پودوں کو قوتِ گویائی مل گئی۔ وہ ان کی زبان سننا اور سمجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ اس کے بس کی بات ہی کہاں تھی۔۔۔۔۔ خوشبو اور حسن تو خود بخود بولتے اور محسوس ہوتے ہیں۔

لوہے کی سفید کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر اس نے آنکھیں موندلیں اور سارے منظر آئینہ ہونے لگے۔ ماضی کے دھند لکے سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ نئے تعمیر شدہ میڈیکل کمپلیکس کے ایک کمرے میں آپی Admit ہیں۔ سرجری میں ابھی دو دن باقی ہیں۔ آپی کے چہرے پر کہیں خوف کی پرچھائیں نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپریشن بھی ہماری زندگی کا حصہ ہو گئے ہیں۔ یہ آپی کا تیسرا اور آخری Cesarian ہے۔ شہر کی قابل ترین گائنا کالوجسٹ On Call ہے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔۔۔۔۔ اللہ آپی کو ایک اور بیٹا عطا کر دے، جوڑی مکمل ہو جائے گی۔ پرسوں سے بھائی جان کتنے خوش ہیں۔ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ دیکھ کر Radiologist نے مبارک دی، لیکن آپی کو ان مشینوں کی زبان پر اعتبار ہی نہیں۔

لیبر روم کا دروازہ کھلا۔

نرس نے کہا۔۔۔۔۔ بچہ لے لیں۔

نرس کے ایک ہاتھ میں بچہ اور دوسرے میں ہیٹر تھا۔ احسن نے بے دھیانی میں ہیٹر پکڑ لیا۔ نرس نے مسکرا کر کہا، بیٹا لینے کو کہا ہے، بوکھلاہٹ میں اس نے بھانجے کو سنبھالا اور کمرے کی طرف بھاگا۔ کاریڈور اور گیلری میں گاؤں سے آئے ہوئے رشتہ داروں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ ہر طرف بیٹے کی مبارک باد کی صدائیں تھیں۔ وہ خود کتنا سرشار تھا۔ اسے بھانجے بھانجیوں سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ جب بھی گاؤں سے شہر کو آتے، وہ ساری مصروفیات ترک کر کے انہیں کارنر کی ایک دکان سے ٹھنڈا ٹھار دودھ پلاتا۔۔۔۔۔ اولیاء کے مزارات کا تعارف کراتا، اپنی سٹیشنری کی دکان سے ان کے لیے رنگ برنگی پنسلیں، ربڑ، شاپنر اور جیومیٹری بکس لے آتا۔ خوشی سے اس کے پاؤں ٹکتے ہی نہ تھے۔ کھانے کے اوقات میں موٹر سائیکل کے ساتھ روسٹ چرغہ لٹک رہا ہے، حلیم سکوائر اور شریف پلازہ سے آپی کے لیے جل فریزی اور اناناس کی قاشوں کا سربمہر ڈبہ لایا جا رہا ہے۔ ایک گہما گہمی نظر آتی۔

نرس نے رشتہ داروں کو وہاں سے ہٹ جانے کو کہا اور آپی کو ڈرپ لگانے لگی۔ یہ وہی چہرہ تھا جو اس نے تھوڑی دیر پہلے لیبر روم کے دروازے پر دیکھا تھا۔۔۔۔۔نرس مسکرائی، آپ کو بھانجے کی اتنی خوشی ہوئی کہ اسے سنبھالنے کی بجائے ہیٹر پکڑ لیا۔۔۔۔۔

جی۔۔۔۔۔Excitement۔۔۔۔۔!

اللہ مبارک کرے۔

ڈرپ لگا کر نرس لوٹنے لگی تو اس کے پاؤں پر احسن کی نظر پڑی۔نفیس ڈوری دار کالی چپل میں گلابی پاؤں اسے بہت بھلے لگے۔نرس نے جاتے ہوئے اسے نسخہ پکڑاتے ہوئے دوائیاں لانے کو کہا۔ہسپتال کی طویل راہداری میں فروری کا سرد جھونکا اسے چھو کر گزرا تو اس نے بغلوں میں ہاتھ دبا لئے اور اپنے سامنے چلتی ہوئی نرس کی ایڑیوں کو دیکھتا رہا۔ یہ اس کا غیر ارادی فعل تھا۔دوسرے روز اس کی آپی ہوش میں تھیں۔ وہ کرسی پر بیٹھا ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ہلکی سی دستک سے دروازہ چرچرایا۔ایک سپاٹ اور خشک چہرے والی نرس نے میکانکی انداز میں آپی کو انجیکشن لگایا اور لوٹ گئی۔ جانے کیوں اسے لیبر روم کے دروازے سے نمودار ہونے والی نرس کا چہرہ، پاؤں اور پلپلی ایڑی یاد آ گئی۔

دس بارہ دن میں وہ اسے کئی بار نظر آئی۔ ریسپشن سے گزرتے ہوئے ہسپتال کی لمبی راہداریوں میں، کاریڈور میں، میز کے گرد ڈاکٹروں اور نرسوں کے درمیان، جانے کیوں اسے اس کی تلاش رہنے لگی۔ گلابی پاؤں اور پلپلتی ایڑی اس کے ذہن میں اٹک گئی۔ کیا میں "Foot Fanticism" کا شکار تو نہیں ہو گیا۔۔۔۔۔؟ لیبر روم کے دروازے سے لے کر آنے ایک ایک دن کی شبیہہ اس کے اندر سماتی گئی۔۔۔۔۔''ہیٹر، بچہ اور پاؤں''۔Triangle جیومیٹری کے زاویے بننے اور مٹنے لگے۔۔۔۔۔Circle نہیں Rectangular۔۔۔۔۔نہیں، تین ہی زاویے ہیں۔Triangle۔۔۔۔۔تعلیمی سفر میں نفسیات اس کا پسندیدہ مضمون رہا۔اسے چہروں کے مطالعے کا جنون تھا۔پہلی بار اسے اپنا مطالعہ درپیش تھا اور وہ خائف تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ Emotional Blocking کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ نرس سے وسیع و عریض ریسپشن کے آرام دہ صوفوں پر بیٹھ کر وہ ساری باتیں کہہ سکے جو ان دس دنوں میں اس نے محسوس کی تھیں۔آپی کے ہسپتال سے Discharge ہونے کے دن جوں

جوں قریب آ رہے تھے، اس کے اندر ہیجان بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ Unconscious Mental Process کے زیرِ عمل خود سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ آخری صبح ـ ـ ـ ـ ـ جس دن آپی کو اس نے گھر لانا تھا ـ ـ ـ ـ ـ اسی رات اس کے ابو کو کسی ضروری کام سے کہیں جانا تھا۔ انہوں نے احسن کو صبح سحری ہسپتال پہنچانے کو کہا اور اسے روزہ نہ چھوڑنے کی تاکید کی۔

رات بھر وہ خواب میں کہاں کہاں نہ بھٹکتا پھرا۔ نیند اور بیداری کی کیفیات میں اس نے رات گزار دی۔ سحری کے وقت اس کی امی نے اسے جگا کر ٹفن کیریئر پکڑا دیا، پورچ میں کھڑے ہو کر اس نے ایک زوردار انگڑائی لی ـ ـ ـ ـ ـ سر پر مفلر لپیٹا، سائیلنسر سے بانسری نکالی، ہیلمٹ سنبھالا، دستانے چڑھائے اور ہسپتال جانے کو موٹر سائیکل باہر نکالا۔ بغیر بانسری کے سائیلنسر سے نکلنے والی کاٹ دار آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔ گلی میں اونگھتے کتوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ مین روڈ پر آ کر اس نے موٹر سائیکل پوری رفتار پر چھوڑ دیا ـ ـ ـ ـ ـ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا ـ ـ ـ ـ ـ وہ چہرہ ـ ـ ـ ـ ـ ایڑی ـ ـ ـ ـ ـ ہیٹر ـ ـ ـ ـ ـ ہسپتال میں گزارے دس بارہ دن ـ ـ ـ ـ ـ وہ ان دنوں کو اپنی زندگی سے منہا کر دینا چاہتا تھا ـ ـ ـ ـ ـ لیکن یادیں جھٹکنے کے باوجود اس سے چمٹی رہیں۔ اس کے اعصاب چیخنے لگے ـ ـ ـ ـ ـ یہ کشمکش کیوں ـ ـ ـ ـ ـ؟ کیا میں ایک گناہ کے عمل سے گزر رہا ہوں ـ ـ ـ ـ ـ اتنے بہت سے چہروں میں آخر ایک ہی چہرہ کیوں ـ ـ ـ ـ ـ؟ Frequency کسے کہتے ہیں؟ ہم کس جنم میں مل چکے ہیں۔ یوں بھی کوئی دھیرے دھیرے اندر اترتا ہے، جیسے دسمبر کی جھڑی کچے مکان کی بنیادوں میں اترتی ہے۔ اسے میرے اندر اترنے کی اجازت کس نے دی ہے؟ یوں اتراتی پھرتی ہے، جیسے گھر ہی اسی کا ہے۔ میرے دل کی جاگیر پر قابض ہونے کا حق کس نے اسے تفویض کیا ہے ـ ـ ـ ـ ـ؟ میں اسے بھول جاؤں گا۔ مکمل طور پر، اس سے پہلے کہ اسے خبر ہو اور وہ مجھے Ignore کرے۔ Ignorance کی سولی پر لٹکنے سے بہتر ہے کہ یادوں کے عذاب جھیل لیے جائیں۔ موٹر سائیکل واپس گلی میں داخل ہوئی تو اس کی ماں نے اسے خوب ڈانٹا۔ وہ ماں کی ڈانٹ سہتا رہا۔ اسے معلوم تھا، اس ڈانٹ کے پس پردہ بھی صرف پیار ہے اور کچھ نہیں ـ ـ ـ ـ ـ

دوپہر کے قریب وہ کمپلیکس گیا۔ نرس نے اسے Discharge Certificate پکڑا دیا۔ ادویات سمجھاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ابھی مریضہ گاؤں کا سفر نہ کرے ـ ـ ـ ـ ـ کاغذات کے پلندے

پر نرس پیپر ویٹ رکھ کر اٹھنے لگی تو احسن نے جھجکتے ہوئے کہا۔

آپ سے ایک بات کہنی ہے۔

''جی۔۔۔!''

''آپ بہت اچھی ہیں۔۔۔۔۔''

''شکریہ۔۔۔۔۔!''

اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔۔آپ کے پاؤں بہت خوبصورت ہیں۔ قلم نرس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اس نے بوکھلاہٹ میں نرس کے ہاتھ سے پیپرز پکڑے اور تیز تیز قدموں سے لوٹ آیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اسے ڈر تھا کہ نرس نے آپی سے کچھ کہہ دیا تو بڑی سُبکی ہوگی۔ وہ نرس سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ کسی سے کچھ نہ کہے۔۔۔۔۔

کمان تیر سے نکل چکا تھا اور نرس کی بجائے وہ خود گھائل ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد نرس نے ایک نظر اپنے پاؤں کو حیرت سے دیکھا اور مسکرا دی۔

پاگل۔۔۔۔۔!

وہ جو گھائل تھا۔ اس کے اندر دن ٹھہر گئے، نرس کے ذہن کی کوکھ میں پاؤں کی تعریف کا بیج بونے کے بعد وہ بے چین رہنے لگا۔ جانے بیج بار آور ہوتا ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔؟ زمین بنجر ہے کہ زرخیز۔۔۔۔۔؟ اسے اس کی یاد میں سانس لینا دشوار ہو گیا۔ ماں بیٹے کے چہرے پر متغیرات دیکھ کر فکر مند رہنے لگی۔ وہ پہروں سویا رہتا۔ صبح کی نماز پر اسے جگانے کی اپنی سی کوشش کی جاتی وہ کروٹیں بدلتا رہتا اور سورج کی آنکھ کھل جاتی۔ ایک دن وہ اسی ذہنی کرب سے نجات کے لیے گھر سے نکلا۔ گلی کی نکڑ پر اکلوتے پان کے کھوکھے سے سگریٹ کی ڈبیا خریدی۔۔۔۔۔ سگریٹ سلگا کر وہ پلٹا ہی تھا کہ چند آدمی جن کے کاندھوں پر بستر اور بغلوں میں بیگ لٹک رہے تھے، چہروں پر نور اور سکینت تھی، اس سے مخاطب ہوئے۔ ان کے چہروں پر پھیلا نور اور لہجے کی ملائمت نے اسے گرفت میں لے لیا اور وہ سگریٹ پھینک کر ان کی باتیں سننے مسجد میں چلا آیا۔۔۔۔۔ اگلی صبح وہ خود بخود میکانکی انداز میں نماز کے لیے بیدار ہوا اور مسجد پہنچ گیا۔ احسن کی ماں اس کے اندر رونما ہونے والی تبدیلی کو گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مسجد میں جانا اس کا معمول ہو گیا اور اس نے یہ

جانا کہ یہ بوریا نشین پورے کرۂ ارض پر اللہ کا نام پھیلانے میں مگن سفر میں رہتے ہیں۔زادِراہ کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔۔۔۔۔اپنے پلے سے سفر کا خرچ برداشت کرتے ہیں، دَردَر پردستک دے کے وہ سبق یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں جو انسان کو بھولنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔

احسن کے کمرے میں اداکاروں کی کئی تصاویر آویزاں تھیں۔Romantic Lips کا قدآدم پوسٹر اس نے ایک دوست سے فرمائش کر کے باہر کے ملک سے منگوایا تھا۔اس کے چھوٹے سے کمرے میں ہروقت موسیقی کے دھیمے دھیمے سُر بجتے رہتے تھے۔ وہ اپنی Paintings اور دیگر مشاغل میں گم رہتا۔انہی مشاغل میں وہ بھی تھی جو چند دن کے لیے اس کے اندر سے گزری اور ایسی مکین ہوئی کہ اب اسے گھر سے نکالنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایسے خیمہ زن ہوئی جیسے دل کی زمین کا یہ ٹکڑا اس کے نام کا تھا۔

احسن پہروں Romantic Lips دیکھتا رہتا۔اس پوسٹر کے بالمقابل ایک اور تصویر آویزاں تھی۔ باغیچہ کے جھنڈ میں سے صرف پاؤں جھانک رہتے تھے اور ٹخنوں کے گرد پائل کا گھیرا تھا۔اس کی ماں نے کتنی ہی بار اسے تصویر اتارنے کا کہا۔لیکن وہ کب کسی کی ماننے والا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی تلاش تھی، وہ اپنی زندگی خود جینا چاہتا تھا۔ اسے اپنی منگیتر کی سیاہ گھنی دراز زلفیں بھی بھول گئیں۔ پرس میں رکھی سبز کپڑوں میں ملفوف اس کزن کا نام بھی بھولنے لگا جو NCC کی وردی میں ملبوس کالج سے لوٹنے پر اسے اچانک ملی تھی اور برسوں سے اس کی تصویر احسن پرس میں لیے پھر رہا تھا۔۔۔۔۔نرس میں کوئی بات تو ایسی تھی۔۔۔۔۔؟ نہ میں نے اس کے ساتھ کوئی عہد و پیمان باندھا نہ Long Drive پر نکلے، نہ کسی کنج کیفے میں کافی کا پیالہ Share کیا۔۔۔۔۔

ایک دن نماز فجر کے بعد بوریا نشینوں میں سے ایک نکلتے ہوئے قد کا جوان جس کے چہرے پر لالی،نور، چمک اور ملائمت تھی، اس کی آنکھوں میں سحر تھا، بیان کے بعد ارادہ باندھنے اور اللہ کے راستے میں نکلنے کو کہہ رہا تھا۔وہ غیرارادی طور پر اٹھا اور اپنا نام لکھوا دیا۔

تین دن۔۔۔۔۔

گھر لوٹ کر اس نے پلنگ کے نیچے سے اپنا بیگ نکالا، اس میں کپڑے ٹھونسے،

بستر باندھا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ ہر روز شہر کی ایک نئی مسجد میں مکین ہوا۔ بوریا نشینوں کی نشست و برخواست دیکھی۔ آخرِ شب اٹھ کر تہجد میں ان کی گریہ وزاری دیکھی۔ انہیں قریب سے جانا۔ انجینئر، ڈاکٹر، ڈائریکٹر، تاجر، طالب علم، دکان دار، زمین دار۔۔۔۔۔۔ زندگی کے ہر شعبے سے لوگ اللہ کے راستے میں نکلتے اوران کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوجاتا۔۔۔۔۔ ان لوگوں میں رعونت نام کو نہ تھی، لہجے میں تلخی اور بے زاری کا گزر تک نہ تھا۔ لہجے دھیمے اور پُروقار تھے۔ یہ لوگ احسن کو ایسے بھا گئے کہ وہ تین دن بعد گھر لوٹنے کی بجائے ان کے ساتھ چالیس دن کے سفر پر نکل کھڑا ہوا اور ماں سے کہہ کر کچھ رقم زادِراہ کے طور پر منگوالی۔

اگلے سفر پر نکلتے ہوئے اسے کمپلیکس کی سیڑھیاں اترتی وہ گلابی ایڑیاں بہت یاد آئیں۔ لیکن وہ اسے روک سکیں نہ باندھ۔۔۔۔۔! شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ گھومتے ہوئے اس نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے چہرے پر رونق اترنے لگی۔ شیو کا سامان اس نے اٹھا کر پھینک دیا۔ شلوار ٹخنوں سے اوپر رہنے لگی۔ اس کے اندر ٹھہراؤ اور طمانیت اترنے لگی۔ وہ آخرِ شب اٹھنے اور گریہ وزاری کرنے لگا۔ باطنی تبدیلی نے اسے نئے افق سے روشناس کرایا۔

چالیس روز بعد وہ گھر لوٹا تو ماں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسی رات اس کے کمرے سے Romantic Lips کی پینٹنگ اتر گئی۔ صبح کمرہ سادگی کا نمونہ تھا۔ دودن بعد اس نے آپی کو گاؤں چھوڑا اور پھر والدین کے ساتھ بیٹھ کر اپنی نئی زندگی کے بارے مشاورت کی۔ کالج کو خیرآباد کہہ کر ایک دینی مدرسے میں داخلہ لے لیا اور حصولِ علم میں مگن ہوگیا۔ بارہ سال میں تکمیلِ علم کے بعد وہ بوریا نشین بستر اٹھا کر غیر ممالک کے دوروں پر نکل کھڑا ہوا۔

تنزانیہ، صومالیہ اور افریقی جزائر کا ایک سال میں دورہ مکمل کرنے کے بعد وہ وطن لوٹا تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ فیصلے کی رات اس پر بہت بھاری گزری۔ اس کے ذہن میں وہ ابھی تک خیمہ زن تھی۔ اسی سوچ میں پانچ سال اور سرک گئے۔ آخر کار اس نے والدین کی دل جوئی کے لیے شادی کا فیصلہ کرلیا شادی انتہائی سادگی سے ہوئی۔ عصر کے بعد مسجد سے وہ سیدھے لڑکی والوں کے گھر گئے اور آدھ گھنٹے میں دلہن رخصت ہوکر اس کی زندگی میں آ گئی۔

کاروبارِ زیست چلتا رہا۔۔۔۔۔ اس کی اولاد جوان ہوگئی۔ ایک روز وہ لان میں بیٹھا

اخبار دیکھ رہا تھا۔ اخبار کے پہلے صفحہ پر چوکھٹے میں ملفوف خبر نے اسے پریشان کر دیا۔

''وصیت: مجھے جرابوں سمیت دفن کیا جائے''

''سٹاف رپورٹر۔۔۔۔ ایک نرس جس کے پاؤں کی اوائلِ جوانی میں کسی نے تعریف کی تھی، اس تعریف کو حرزِ جان بنا کر جرابیں پہننا اس نے اپنا معمول بنا لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نوجوان کے بغیر میں اپنے پاؤں اور کسی کے لیے نہیں کھولوں گی۔ اگر مجھے موت آ جائے تو جرابوں سمیت دفن کر دیا جائے۔ اس کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اسے جرابوں سمیت دفن کر دیا گیا۔''

چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگی۔ ماضی کے آئینے میں اس نے اپنے چہرے کی سلوٹوں کو چھو کر دیکھا، وہ ہر سلوٹ میں موجود تھی۔ فروری کی ٹھنڈی دھوپ میں اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔۔۔۔۔ بند آنکھوں کے آئینے میں اس نے اپنے آپ کو تلاش کیا۔۔۔۔ وہ کہیں نہیں تھا، بس وہ تھی اور موت کی سرد ہوا۔۔۔۔!

☆☆☆

تسبیح کے دانے

یہ ایک دیو کی کہانی ہے۔ اسے بڑی عمر کے لوگ بھی پڑھ سکتے ہیں لیکن کہانی پڑھنے کے دوران آداب ملحوظ خاطر رہیں کیوں کہ اب دادی ماں کہانی نہیں سنایا کرتی ہیں ہم نے بڑی مشکل سے

دادی ماں کو اس بات پر رضامند کیا ہے کہ بچپن میں وہ ہمیں جو دیو سفید کی کہانی لحاف میں بیٹھ کر سنایا کرتی تھیں اب ہمارے بچوں کو بھی سنائیں۔ دادی ماں کا کہنا ہے میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں باتونی بہت ہیں۔ ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ کہانی سنانے کے دوران یہ اپنی لایعنی باتوں کی اتنی پیوندکاری کرتے ہیں کہ کہانی کا تسلسل برقرار نہیں رہتا۔ مجھے کہانی کا گم شدہ سرا تلاش کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ ذہن پر زور دے کر بمشکل سرا پکڑتی ہوں۔ دیو سفید میرے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ ہم نے دادی ماں سے پوچھا دیو سفید کیسے آپ کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔

بیٹا یاداشت کمزور ہو گئی ہے۔ ضعیفی نے گرفتار کر رکھا ہے۔

دادی ماں جیسے ایک طاقت ور ملک نے کمزور ممالک کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ بچے تو بچے تم بڑے بھی بولنے سے باز نہیں آتے۔

سارے بچوں نے فیصلہ کیا کہ آج رات دادی ماں سے دیو سفید کی کہانی سنی جائے۔ انہیں دیو سفید سے زیادہ حسن بانو سے دلچسپی تھی جو اس دیو کی قید میں تھی۔ کہانی میں ایک بادشاہ تھا۔ نام تھا اس کا شاہ بہرام اور وہ تھا کہانی کا مرکزی کردار۔۔

کہا ہے نا۔۔۔ ہم نے دادی ماں کو کہانی سنانے پر بڑی مشکل سے رضامند کیا ہے

کہانی سننے سے پہلے بچوں نے کچھ فیصلے کیے۔

ٹیلیویژن بند رہے گا۔ کمپیوٹر پر گیم اور کارٹون نہیں چلیں گے۔ کہانی کے دوران بولنے پر پابندی کو بنیادی شرط قرار دیا گیا۔ اور یہ بھی طے پایا کہ آج بتیاں گل کر کے لالٹین کی روشنی میں کہانی سنی جائے۔

ایک شرارتی بچے نے کہا۔

دادی ماں امریکہ سے ڈرتی ہیں کہ کہیں وہ ہم پر بھی حملہ نہ کر دے اس لیے بلیک آؤٹ کر کے لالٹین کی روشنی میں کہانی سنائی جائے گی۔۔۔ ہی ہی ہی ہی

دادی ماں نے یہ باتیں سن لیں نا۔۔۔ تو حسن بانو کی کہانی ادھوری رہ جائے گی۔

لگتا ہے تمہیں حسن بانو سے کچھ زیادہ ہی عشق ہو گیا ہے۔

کیوں نہ ہو۔۔۔ اسے دیو کی قید سے آزادی تو دلانی ہے۔۔۔ قید آخر قید ہوتی ہے۔

پہلے ہم کون سے آزاد ہیں۔۔۔؟
فلسفہ اور تاریخ نہ جھاڑو۔لالٹین صاف کرانے کا بندوبست کرو۔
اتنے میں دادی ماں کی آواز سنائی دی۔
بہو لالٹین صاف کرا دی ہے۔
ہو رہی ہے اماں جی۔۔۔ا

گھر میں کوئی طاقچہ نہیں تھا لالٹین صاف کر کے میز پر سجا دی گئی۔ وہیں ایک پیتل کا پرانے وقتوں کا مرصع لیمپ بھی رکھا ہوا تھا جس میں مٹی کے تیل کی بجائے اب زیرو کا بلب جلتا تھا۔اسے وقت کی رفتار نے ڈیکوریشن پیس بنا دیا تھا۔

رات کے کھانے پر بھی موضوع دیو سفید ہی تھا۔

کھانا کھا کر سب دادی ماں کے گرد جڑ کر بیٹھ گئے۔ دادی ماں کے چہرے پر نورانی ہالہ تھا۔سفید لباس میں ان کا تقدس اور ابھر آیا تھا۔تسبیح سرہانے رکھ کر ابھی انہوں نے کہانی شروع بھی نہیں کی تھی کہ ان کی پوتی بولی۔

دادی ماں۔۔۔ہوم ورک تو ہم نے سکول سے آتے ہی کر لیا تھا۔آپ نے اسی وقت کہانی سنا دی ہوتی۔

بٹیا۔۔۔دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں
دادی ماں۔۔۔مسافر اب پیدل نہیں بلکہ بسوں کاروں ٹرینوں اور جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔
بس ہو گئی کہانی۔۔۔۔ایک پوتا جھلایا۔
مت ڈانٹو اسے۔۔۔تمہاری چھوٹی بہن ہے۔

اگلے وقتوں کی بات ہے۔ملکِ فارس میں ایک بادشاہ تھا۔نام تھا اس کا شاہ بہرام۔االلہ نے اس پر حسن انڈیل دیا تھا۔اس کی سلطنت بڑی وسیع وعریض تھی ہر طرف اس کے انصاف اور رحمدلی کا ڈنکا بجتا تھا۔ایک بار بادشاہ اپنے مصاحبین کے ہمراہ سیر کو نکلا' سیر میں شکار بھی شامل تھا۔ پہلا پڑاؤ ایک جنگل میں تھا۔جنگل میں اترتے ہی خیمے لگا دیے گئے۔تخت بچھا دیا گیا۔باورچی قناتیں لگا کر انواع واقسام کے کھانے تیار کرنے لگے۔کھانوں کی اشتہا بھوک کو اور سوا کرتی تھی۔بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا رقص وسرود سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ناگاہ ایک سفید گھوڑا آسمان سے اترا۔نگاہ اس

پر ٹہرتی نہ تھی۔ مصاحب اس کی طرف دوڑے وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ سب نے اپنی سی کوشش کر دیکھی اور تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

بادشاہ نے خود گھوڑے کی طرف قدم بڑھائے۔ گھوڑے نے گردن جھکا دی۔ تالیوں کے شور میں مصاحبین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ گھوڑا آپ کے لیے بھیجا ہے۔ بادشاہ اس پر سوار ہو۔ گھوڑا دلکی چال چلنے لگا۔ مسرور بادشاہ اس کی پشت پر کروفر سے بیٹھا تھا۔ گھوڑے نے میدان میں دو تین چکر کاٹے تالیوں کی گونج بڑھتی گئی۔ تالیوں کی گونج کے ساتھ گھوڑے کی رفتار بھی بڑھنے لگی اچانک ایک چکر میں اس نے فضا میں جست بھری اور اڑا۔ مصاحبین دیکھتے رہ گئے اور گھوڑا سوار سمیت نظروں سے غائب ہو گیا۔

میرے خیال میں رائٹ برادران نے پرندوں کی بجائے گھوڑوں کی کہانیوں سے ہی ہوئی جہاز بنانے کا آئیڈیا لیا ہوگا۔۔۔۔ دادی ماں کا پوتا بولا چپ۔۔۔ کہانی کے دوران بولنے کی ممانعت ہے۔۔۔ دادی ماں کی پوتی بولی عجیب بات کہی تم نے۔۔۔ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا گھوڑا ہمارے بادشاہ سلامت کو اغوا کر کے اپنے ملک لے گیا اور تم کہتی ہو بولنے کی ممانعت ہے اب سائینس کا عہد ہے وہ ہمارے بادشاہ سلامت کے دماغ میں کوئی Chip فٹ کر دے پھر کیا ہوگا۔۔۔؟

بڑی مشکل سے بچوں کی ماں نے انہیں چپ کرایا۔ بچوں کو دادی ماں کا تو سرے سے ڈر تھا ہی نہیں دادی ماں کا کہنا تھا کہ بلاوجہ جھڑکنے' ٹوکنے اور سزا دینے سے بچوں کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور ان کی شخصیت کا تاروپود بکھر جاتا ہے۔

گھوڑا ایک طلسماتی دنیا میں جا اترا۔ باغات' نہریں' جھرنے' فوارے' سبزے کی روشیں' پرندوں کے چہچہانے کی سریلی آوازیں' جنتِ ارضی کا نمونہ تھا۔ بادشاہ عالمِ تحیر میں تھا گھوڑے نے جون بدلی۔ بادشاہ کے سامنے ایک دیو ہیکل بلا کھڑی تھی۔ شاہ بہرام۔۔۔ اس کی آواز گونجی' زمین تھرائی۔۔۔ میرا نام دیو سفید ہے۔ یہ میری سلطنت ہے۔ میری طاقت کا اندازہ تمہیں ہو گیا ہوگا۔ میں من موجی ہوں۔ جس ملک میں چاہوں لمحوں میں جا پہنچتا ہوں جس کو چاہوں اٹھا لاؤں مجھے کوئی روکنے والا نہیں مجھے جو پسند آ جائے اسے اٹھا کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیتا ہوں۔ تم بھی مجھے پسند آئے اور میں نے تمہیں اٹھانے کا پروگرام ترتیب دے ڈالا اور آج میں بہت خوش ہوں۔ تم میرے ہو۔ میری سلطنت میں رہو' راج کرو۔ میری مانو گے تو ساری عمر سکھی رہو گے۔ میں

تمہیں مالا مال کر دوں گا۔اپنے خزانوں کے منہ تم پر کھول دوں گا۔

لو۔۔۔یہ لو۔۔۔اس باغ کی کنجیاں۔۔۔اس نے کنجیاں شاہ بہرام کی طرف پھینکیں تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔آرام سے رہو۔جہاں چاہو گھومو پھرو۔لیکن ایک بات کا خیال رہے۔ہماری دنیا تمہاری دنیا سے مختلف ہے۔تم پسماندہ اقوام میں سے ہو۔ہم دیو ہیں ہمیں حکومت کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ہمارے کچھ اصول ہیں۔تم بھی سن لو ہمارے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہ کرنا۔ہمارے راز جاننے کی کوشش بھی تمہیں مہنگی پڑے گی۔ایک راز ہے' سر بستہ۔۔! اس باغ کے مشرقی سمت ہم نے سونے اور چاندی سے ایک محل تعمیر کیا ہے۔کیوں تعمیر کیا ہے۔۔۔؟ یہ بات تمہارے لئے خارج از بحث ہے۔تم نے اس باغ میں قدم نہیں دھرنا۔۔۔ان چابیوں کے گچھے میں ایک چابی سونے کی ہے۔

یہ کہہ کر دیو سفید نے اڑان پکڑی اور غائب ہو گیا۔

دادی ماں۔۔۔پھر آگے کیا ہوا۔۔۔؟

مجھے الائچی منہ میں رکھ لینے دو۔دادی ماں الائچی منہ میں رکھنے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔؟

منہ خشک نہیں ہوتا۔۔۔تم سوال بہت کرتے ہو۔۔۔دادی ماں نے کہا۔گریٹ دادی ماں۔۔۔لائٹ آن کر دوں۔۔۔لالٹین کی روشنی میں دم گھٹ رہا ہے۔تم جانتے ہی ہو حالات خراب ہیں ایمر جنسی چل رہی ہے۔کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔اندر باہر بلیک آوٹ ضروری ہے۔۔۔!

خوش بختو۔۔۔یہ اندر کا بلیک آوٹ کیا ہوتا ہے۔۔۔' دادی ماں نے پوچھا۔دادی ماں۔۔۔روح کا چراغ بجھ جائے نا تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔اور پھر سارے فیصلے اندھے ہوتے ہیں۔اگر دراندازی کی رفتار یہی رہی تو کہانی ایک سال میں بھی مکمل نہیں ہوگی۔

چپ۔۔۔بھئی۔۔۔مکمل چپ۔۔۔اب نہیں بولنا

جی دادی ماں۔۔۔تو آپ کہہ رہی تھیں۔۔۔''بی باون'' نے اڑان پکڑی ہیں ں ں ں ں ں ں۔۔۔یہ نگوڑا ''بی باون'' کیا ہوتا ہے۔

دادی ماں آپ ہی تو کہ رہی تھیں۔۔۔'' دیو سفید نے اڑان پکڑی اور غائب ہو گیا اچھا اچھا۔۔۔یہ دیو کا انگریزی نام ہے۔چھپن سال گزر گئے ہماری ذہنی غلامی نہ گئی شاہ بہرام

نے وہاں بسرام کیا۔
ایک دن اس کے من میں تجسس نے انگڑائی لی اور اس نے سونے چاندی کے محل کی سیر کا ارادہ باندھا۔ پہلے وہ ہچکچایا۔۔۔ڈرا، لیکن خواہش غالب آ گئی۔ جب وہ محل میں داخل ہوا تو تحیر سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یا خدا۔۔۔ یہ میں زمین پر ہوں یا جنت میں آ نکلا ہوں۔ ایسے مناظر تو دیکھے نہ کبھی سنے۔۔۔!
وہ قدم قدم آگے بڑھا۔ تالاب میں پانی کی لہریں یوں انگڑائیاں لے رہی تھیں کہ ان سے موسیقی کی مدھر تانیں بہہ کر سماعت میں رس گھولتی تھیں۔ وہ ایک لہر کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سارے لمس اپنے اندر اتار لینا چاہتا تھا۔ وہ ابھی پانی کے لمس میں ہی کھویا تھا کہ اچانک اس نے ایک کشادہ چاندی کی روش پر تین پریاں دیکھیں۔ وہ تالاب کی سمت ہی آ رہی تھیں۔ وہ اوٹ میں ہو گیا۔ دو پریوں نے اودے پیلے رنگ کا اور ایک پری نے سرخ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ سرخ لباس والی اپنے حسن میں یوں یکتا تھی کہ چاند بھی مقابل رکھا جائے تو ماند پڑ جائے۔ وہ لباس اتار کر تالاب میں اتر گئیں۔ پانی میں رنگ بھر گئے۔ شاہ بہرام دبے پاؤں آگے بڑھا اور سرخ پری کا لباس چرا لیا۔ یہ وہی لباس تھا جو پریوں کو اڑنے میں معاون ہوتا ہے۔
کتنی دیر وہ نہاتی اور ایک دوسرے پر پانی اچھالتی رہیں تالاب سے نکل کر جب انہوں نے لباس دیکھا تو غائب۔۔۔ ان کی آنکھوں میں خوف اتر آیا انہوں نے باغ کا کونا کونا چھان مارا اودے پیلے لباس والی لڑکیوں نے تھک کر کہا کہ ہم تو چلیں اور پرواز کر گئیں۔ سرخ پری زیرِ دام آ گئی تھی
دادی ماں کی کہانی قدم قدم پر رزلٹ آؤٹ کر رہی ہے۔۔۔ ایک پوتے نے انگڑائی لے کر کہا۔
واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ دادی ماں۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیو سفید اتنا چالاک تھا کہ اس نے ہر کسی کو پھانسنے کے لیے الگ الگ نیٹ ورک پھیلا رکھا تھا۔ گھوڑے کا روپ، کہیں باغات کا جھانسہ، تالاب اور کہیں دھونس دھاندلی۔۔۔! لیکن اصل مقصد صرف انسانوں اور پریوں کو پھانسنا تھا۔ یعنی یہ اس کا مشغلہ تھا۔۔۔ دوسرے پوتے نے مونگ پھلی کا خالی شاپر ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے کہا۔
کہانی میں چائے کا وقفہ۔۔۔۔۔!
دادی ماں نے کہا، بچوں کو اونگھ آ رہی ہے۔ بہو چائے بنا لاؤ

سرخ پری پریشان تھی۔۔۔۔۔۔

اس نے آواز لگائی۔۔۔تم جن ہو۔۔۔انسان' بھوت پریت یا کوئی اور مخلوق' میرے سامنے آؤ۔۔۔!

شاہ بہرام نے اوٹ سے انسانی لباس اس کی جانب پھینکا لباس پہن کر وہ شاہ بہرام کے سامنے تھی ۔۔۔شاہ بہرام کبھی آسمان پر بادلوں کی اوٹ میں سے نکلتے چھپتے چاند کو دیکھتا تو کسی لمحے سرخ پری کو اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون زیادہ خوبصورت ہے۔۔۔؟

تم کون ہو۔۔۔؟

میں شاہ بہرام ہوں

میں بدقسمت حسن بانو ہوں

بدقسمت کیوں۔۔۔؟

دیو سفید نے مجھے اسیر کرنے کے لیے یہ سارا جال پھیلایا۔میں اس کے ہاتھ نہ آئی۔ابھی وہ آئے گا۔زندہ تم رہو گے نہ میں۔۔۔!ایک ہی راستہ ہے

کون سا۔۔۔؟

تم مجھے میرا لباس لوٹا دو تا کہ میں شہرِ پرستان کو پرواز کر جاؤں

یہ تو ممکن نہیں۔۔

ضد نہ کرو۔۔۔وہ بہت طاقت ور ہے

دیو سفید مجھ سے محبت کرتا ہے۔وہ میرا دوست ہے

وہ کسی کا دوست نہیں۔۔۔بس اپنے مفادات کا دوست ہے۔اسے دوست دشمن کی تمیز ہی نہیں وہ اپنے مفادات کے لیے سب کو کچا چبا جاتا ہے۔

شاہ بہرام کی ضد کے سامنے حسن بانو نے ہتھیار ڈال دیے اور ایک لائحۂ عمل طے کیا کہ دیو سفید کا سامنا کیسے کرنا ہے۔۔۔!

لحاف' بچے اور دادی ماں۔۔۔چائے آ گئی

داستان تھوڑی دیر کے لیے سانس لینے کو رکی

اور بچوں کی منطق چل پڑی

ہماری دادی ماں کا ارادہ گوانتاناموبے جانے کا ہے

یہ صوبہ بلوچستان کا کوئی علاقہ ہے۔۔۔دادی ماں نے معصومیت سے پوچھا

دادی ماں۔۔۔اچھی اچھی دادی ماں۔۔۔یہ علاقہ بھی دیو سفید کی سلطنت میں آتا ہے

دادی ماں روٹھ گئی اور کہانی سنانے سے انکار کر دیا

تم بس انٹرنیٹ اور کیبل پر بیٹھا کرو۔۔۔وہی تمہارا قبلہ کعبہ ہے۔نماز نہ روزہ۔۔۔مُن نے کتنی بار نماز کی تاکید کی تمہارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پکی حدیث ہے میرے نبی سوہنے ﷺ کی۔بالکل پکی۔۔بخاری شریف میں لکھی کھڑی ہے کہ جو صبح کی نماز کے لیے نہیں اٹھتا شیطان اس کے کان میں

پیشاب کر جاتا ہے اور سارا دن نحوست چھائی رہتی ہے۔

چپ کیوں ہو گئے ہو۔۔۔؟ دادای ماں نے پوچھا

دادی ماں۔۔۔وہ۔۔بات یہ ہے۔۔۔اس کے ایک پوتے نے ہکلاتے ہوئے کہا

بولو

میں ایک دن مطالعہ کر رہا تھا۔ایک نفسیات دان ہے ''ژونگ''۔۔۔اس نے لکھا تھا کہ جو لوگ صبح سویرے نہیں اٹھتے' سورج نکل آنے پر بھی سوئے رہتے ہیں انہیں کسلمندی ایسا گھیرتی ہے کہ وہ سارا دن اپنے آپ کو تھکا تھکا اور نڈھال محسوس کرتے ہیں

یہی تو نحوست ہے۔موئے سونگ کی بات تمہاری عقل میں آ گئی

دادی ماں۔۔۔سونگ نہیں ژونگ۔۔۔!

جو بھی نام ہے اس کی باتیں تمہارے دل کو بڑی لگتی ہیں

کہانی بار بار کٹ رہی تھی شہر کے اس گنجان آباد علاقے کی بجلی کی طرح جہاں تاروں کا الجھاؤ مسئلہ پیدا کرتا ہے۔

فیصلہ کیا گیا اب جو بھی دخل اندازی کرے گا اسے نکال باہر کیا جائے گا۔

مونگ پھلی کے بعد اب چلغوزے ان کی زد میں تھے

چائے کی بھاپ سے کہانی اٹھی

میں کہہ رہی تھی۔۔۔شاہ بہرام کی ضد کے سامنے حسن بانو نے ہتھیار ڈال دیے اور ایک لائحہِ عمل

طے کیا کہ دیو سفید کا سامنا کیسے کرنا ہے۔۔۔!

آندھی آئی۔۔۔اس میں سے دیو سفید برآمد ہوا

اس نے دیکھا شاہ بہرام بے ہوش ہے تو اس کے اپنے ہوش اڑ گئے

وہ اس کے اردگرد گھومنے لگا

بول۔۔۔بول میرے دوست۔۔۔تجھے ہوا کیا ہے۔۔۔؟ کس غم نے تجھے آلیا ہے۔۔۔بول میں

تیرے لیے کیا کروں۔۔۔؟ تو تو میرا دوست ہے۔۔۔!

بڑی دیر بعد شاہ بہرام نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔۔۔اور دھیرے سے کہا

حسن بانو۔۔۔!

حسن بانو کا نام سن کر دیو سفید چکرایا' دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا

ایکسیلنٹ۔۔۔گویا اس پر MOB گرا۔بہترین موقع تھا شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاس

انتقام لینے کا افسوس عاقبت نااندیشوں نے گنوا دیا۔

دادی ماں نے الائچی منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔۔اب بولے تو تھپڑ بھی لگے گا

ہاں دادی ماں۔۔۔بولنے والوں کو تھپڑ لگنے چاہئیں

یہ کہانی ادھوری رہے گی

جن کہانیوں پر مسلسل بمباری کا عمل جاری ہو وہ کیسے مکمل ہو سکتی ہیں۔۔۔؟

تم اپنی رائے زنی کی بمباری بند کرو

بچوں کی ماں نے سب کو چپ کرایا۔۔۔۔

اب اٹھو۔۔۔سارے۔۔۔وضو کر کے عشاء کی نماز ادا کرو پھر کہانی۔۔۔!

دادی ماں اس دن تو آپ نے کہا تھا عشاء کی نماز کا وقت صبح صادق تک ہوتا ہے

آج اول وقت میں پڑھ لو اس کا اپنا الگ ثواب ہے۔کہانی ختم ہوئی تو تم سب بستروں میں جا سر دو گے

دیو سفید چکرایا' دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا

اب شاہ بہرام اور حسن بانو کے سر بن آئی کہ یہ کیا ہو گیا۔۔۔؟

سوطریقے آزمائے تب کہیں جا کر دیوسفید کو ہوش آیا

اس کا رنگ زرد تھا نڈھال لہجے میں دیوسفید نے یہ اعتراف کیا کہ حسن بانو کی تلاش اور تمہاری اس خواہش کی تکمیل میرے بس کا روگ نہیں۔ یہ سارے جال میں نے اسے پھانسنے کو بچھائے ہیں۔ لیکن وہ زیرِ دام نہیں آئی۔

حسن بانو دہشت گرد ہے اس لیے ہاتھ نہیں آرہی۔ دیوسفید بیچارے کو اپنا جان کا خطرہ ہے

بہت ہوگئی۔۔۔

کہانی ختم۔۔۔۔!

گریٹ دادی ماں ۔۔گریٹ دادی ماں ۔۔۔ویری سوری۔۔۔اب پکا وعدہ۔۔ ہم مسلمان حکمرانوں کی طرح بالکل نہیں بولیں گے۔۔۔آپ کہانی مکمل کریں

حسن بانو زیرِ دام آگئی ہے۔۔۔شاہ بہرام نے کہا

کیسے۔۔۔؟

دیو نے ساری کتھا سنی اور شاہ بہرام کا اس سے نکاح کر دیا۔ زندگی پھر جنت ہوگئی۔

ایک دن حسن بانو نے دیکھا کہ شاہ بہرام کا چہرہ اترا ہوا ہے اور وہ اداس ہے

تم اداس کیوں ہو۔۔۔؟

وطن کی یاد ستارہی ہے۔ بیوی بچے یاد آرہے ہیں۔ عوام کا درد بے چین کر رہا ہے۔ میرے بعد وہ لٹیرے وزراء کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ جانے وہاں زندگی کن عذابوں سے گزر رہی ہوگی۔

دیوسفید کے سامنے درخواست رکھی گئی۔ اے باشاہوں کے بادشاہ۔۔۔ہمیں وطن لوٹنے کی اجازت دی جائے۔

ایک عرصہ غور وخوص میں گزر گیا۔ حسن بانو کی ضد تھی کہ پہلے شہرِ پرستان جایا جائے۔ وہاں سے پھر شاہ بہرام کی سلطنت کی طرف رختِ سفر باندھا جائے۔ پریشانی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کسی کو بھی پرستان کا رستہ معلوم نہ تھا۔ اپنی تمام تر طاقت کے باوجود دیوسفید بھی اس شہر کی تلاش میں ناکام رہا تھا۔ حالاں کہ ہاں کے خزینوں کے قصے سن سن کر وہ ہمیشہ چڑھائی کے منصوبے ترتیب دیتا رہتا تھا۔

دیوسفید نے اپنے چاروں بھائیوں کو مدعو کیا دیوسفید کے کہنے پر پانچوں بھائی سر جوڑ بیٹھے۔ ان میں

دیوزردگرد، دیوجرموس، دیوفرموس اور دیوروپرس شامل تھے۔سب سے کہا گیا کہ وہ اپنی سلطنت میں ڈھنڈورچی سے اعلان کا کہیں کہ کہیں کوئی ایسا شخص جسے شہرِ پرستان کا رستہ معلوم ہو۔۔۔

ڈھنڈورچیوں نے گلی گلی صدا لگائی۔ایک ضعیف العمر دانشور نے عندیہ دیا کہ اسے رستہ معلوم ہے لیکن پہلے اسے شاہ بہرام کی زیارت کرائی جائے۔کیوں کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک نجات دہندہ آئے گا۔دانشور اتنا ضعیف تھا کہ پلکیں لٹک کر بینائی میں حائل تھیں۔اس بوڑھے دانشور دیو کی پلکیں کھولنے کے لیے بڑے بڑے درخت گرا کر شہتیر بنائے گئے۔پلکوں کے نیچے شہتیر لگا کر انہیں اوپر اٹھایا گیا۔بینائی کچھ بحال ہوئی اس نے شاہ بہرام کی زیارت کی اور کہا شہرِ فارس کی مغربی سمت ایک کالا پہاڑ ہے اس میں ایک سرنگ رستہ بناتی ہے۔سرنگ کا سفر تاریک اور تھکا دینے والا ہے۔میں شاہ بہرام کو ایک چراغ دوں گا۔جس سے نہ صرف تاریکی چھٹ جائے گی بلکہ ہر قدم اور ہر مشکل گھڑی میں وہ شاہ بہرام کے کام آئے گا۔

پانچوں دیو دانشور کی باتیں انہماک سے سن رہے تھے

بچے اونگھنے لگے تھے

شاید انہیں نیند نے آلیا تھا۔۔۔؟

کیا وہ جاگ رہے تھے۔۔؟

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔۔۔

کیوں کہ دادی ماں کے ہاتھ میں جو تسبیح تھی اس کا تاگہ ٹوٹ گیا تھا اور دانے گود میں بکھر گئے تھے

بہو نے کہا۔۔۔ماں جی۔۔۔بچے سو گئے ہیں انہیں مت جگائیں

لیکن بہو کیوں۔۔۔؟

جاگ بھی گئے تو کون سے ان کے بھاگ جاگ جائیں گے۔جاگنے پر بھی انہوں نے اودھم مچانا ہے پانچوں دیوٗ دانشور کی باتیں انہماک سے سن رہے تھے

اور دادی ماں کے ہاتھ میں جو تسبیح تھی اس کا تاگہ ٹوٹ گیا تھا اور دانے گود میں بکھر گئے تھے۔۔۔!

☆☆☆

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

گھڑی، سمت، سوئیاں

کیا آپ کی کلائی پر گھڑی موجود ہے۔۔۔؟
اس افسانے کی تمام کڑیاں آپ کی کلائی پر موجود گھڑی سے جڑی ہیں۔افسانہ پڑھنے سے پہلے

گھڑی اور سوئیاں غور سے دیکھ لیجیے۔ افسانہ سمجھنے میں آپ کو آسانی رہے گی۔ وقت کا معلوم ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اگر آپ نے وقت کے دائرے سے باہر بیٹھ کر افسانے کو سمجھنے کی کوشش کی تو بھی ممکن ہے کوئی سرا آپ کے ہاتھ نہ آئے۔ اس کا بھی امکان موجود ہے کہ افسانے کے کردار آپ سے آنکھیں چرائیں لیکن آپ کو ان کے ساتھ رہنا ہے۔ تاریخ پر آپ کا مطالعہ کیسا ہے۔۔۔؟ اگر عمیق ہے تو افسانہ آپ پر اپنے سارے دروازے کھول دے گا۔ اس میں برمودا ٹرائی اینگل کا ذکر ہے۔ آپ بحر اکاہل کی اس تکونی پٹی کے بارے میں کس حد تک معلومات رکھتے ہیں۔ یہ وہ پراسرار تکونی پٹی ہے جس کے حصار میں آنے والے بحری اور ہوائی جہاز غرقاب ہو جاتے ہیں۔ انسانی معلومات کی حد تک پہلے جہازوں کے سسٹم میٹرز کی سوئیاں الٹا چلتی ہیں۔ پھر وہ تکونی بھنور انہیں اپنی گرفت اور شکنجے میں لے کر ہمیشہ کے لیے غرق کر دیتا ہے۔ جیسے انسان لحد میں اتر کر کوئی خبر نہیں بھیج سکتا ویسے ہی وہ تکونی بھنور ان جہازوں کو نامعلوم دنیا میں اتار دیتا ہے۔ بحرا لکاہل سے گزرنے والی پروازوں کو کڑی ہدایات ہیں۔ یہ وہ اسرار ہے کہ انسان تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود اس معمے کو حل نہیں کر سکا۔ اس پر دبیز پردے پڑے ہیں۔ عالمی فضائی روٹس میں اس زون کو ریڈ مارک کر دیا گیا ہے تاکہ تباہی سے بچا جا سکے۔

آپ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیاں دیکھ لیجیے

یونس ویر۔۔۔! یہ افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کردار کے بارے یہ نہیں معلوم کہ اس میں زندگی رمق ہے یا نہیں۔ یہ زندہ ہے مردہ۔۔۔؟ یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جس کی سانسوں میں سکس ہے۔ مجھے اس سے بات کرنا ہے۔ لیکن اس کا انہماک کہہ لیجیے یا غفلت کہ وہ میری بات پر توجہ ہی نہیں دے رہا۔ میں بہت دیر سے اس کے ساتھ بات کرنے کی خواہش دل میں دبائے اس کے ویڈیو سنٹر میں آتے جاتے گاہکوں کو دیکھ رہا ہوں۔

یونس ویر۔۔۔ میری بات تو سنو

کہو

تم میری بات سن رہے ہو۔۔نا۔۔۔؟

یہاں تعفن بہت ہے

اس نے ایر فریشنر اٹھا کر سپرے کر دیا

یہ تعفن یوں دور ہونے سے رہا
تمہیں محسوس نہیں ہو رہا
نہیں تو۔۔۔!

ہاں ہو گا بھی نہیں۔۔۔تم تمبا کو فروش ہو۔۔تم نے کبھی دیکھا کہ تمبا کو فروش کو بھی اپنے کام سے گھن آئی وہ اس تعفن کا عادی ہو جاتا ہے وہ اسی میں سانس لیتا ہے۔اس کے دماغ کے خلیے مر جاتے ہیں۔اب کام سمیٹو اور گھر کی راہ لو۔تمہارے بیوی بچے تمہارا انتظار کھینچ رہے ہوں گے۔دیکھو تو رات تمہارے وجود میں سے گزر رہی ہے۔

یار تم چپ نہیں رہ سکتے۔۔۔؟ کیا سننا چاہتے ہو مجھ سے۔۔۔؟ میں مکمل رات ہوں۔اتھاہ تاریکی۔میں نجس ہوں میرا دماغ مر چکا ہے اس میں کوئی خلیہ زندہ نہیں ہے۔میرے دماغ کے ہر خلیے میں تمہیں عورتوں کے ننگے جسم تھرکتے نظر آئیں گے۔میں اس شہر کا مردہ انسان ہوں، میں اس گلی اس شہر کی لعنت ہوں۔میں رات میں ایک فلم باقاعدگی سے دیکھتا ہوں۔کیوں دیکھتا ہوں۔۔۔؟ یہ میرا نجی معاملہ ہے کسی کو حق نہیں کہ وہ میری ذاتی حدود میں قدم دھرے۔یہاں سے گھر جاتے ہوئے میں بلیو پرنٹ کی سی ڈی ساتھ لے جاتا ہوں۔میرا دماغ تمبا کو فراش کا کباڑ خانہ ہے۔میں رات گئے کمپیوٹر پر ویب سائٹس کھولتا ہوں۔ہزاروں کی تعداد میں نیوڈ ویب سائیٹس جو ایک کلک پر موجود ہیں۔میں اپنا وجود کسی ایک ویب سائیٹ میں پھینکتا اور اپنی تباہی کا تماشا دیکھتا ہوں۔میں تمہاری اس گلی کا مردہ انسان ہوں۔تم مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہو۔۔۔؟ یہ میرا ویڈیو سنٹر ہے۔۔۔میرا ذاتی اثاثہ۔۔!

مجھ پر کوئی قدغن نہیں۔مجھے یہ ڈر بھی نہیں کہ سب چھپ کر دیکھنا ہے۔رات گئے میں ڈیکوڈر پر ایسے چینل تلاش کر لیتا ہوں جن میں کھو کر مجھے خبر ہی نہیں رہتی کہ کب سحر ہوئی۔میں تمہارا معاشرہ ہوں میں رات بھر جاگتا اور دن بھر سوتا ہوں۔دن میں چند گھنٹے روبوٹ کی طرح کام کرتا ہوں۔یہ جسے تم رات کہہ رہے ہو یہ رات نہیں دن ہے۔اقدار بدل گئیں اور تم ایسے بے خبر انسان ہو کہ تمہیں خبر ہی نہیں اب سورج رات میں طلوع ہوتا ہے۔دن سونے کے لیے اور رات کام کرنے کے لیے ہے۔

یونس ویر۔۔۔میں تمہارا دوست ہوں۔تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔مجھے تمہیں نصیحت کرنا ہے اور نہ

اخلاق کا درس دینا ہے اور نہ راہِ راست پر لانے کے لیے تمہارے سامنے تجربات کی پٹاری کھولنی ہے۔ مجھے تو صرف یہی کہنا۔۔۔!

اس نے میری بات اچک لی

اکیلا کہاں ہوں میں۔۔۔۔ ابھی تم دیکھو گے۔ بہت کچھ دیکھو گے۔ رات ڈھلنے دو۔ سورج طلوع ہوگا۔ کئی شرفاء اور پردہ نشیں بلیو پرنٹ کی سی ڈیز لینے کو آئیں گے۔ ڈبل ایکس کا کیا ہے۔ یہ دیکھو سامنے ریک میں ہزاروں کی تعداد ہے۔ یہ فن ہے' آرٹ ہے۔ اگر تمہیں اس آرٹ کی سمجھ نہیں ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

یار تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ تم صرف رات میں گھر وقت پر چلے جایا کرو کیسے چلا جایا کروں۔۔۔؟ یہ روزی بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔ یہ آزار کس کے لیے کھینچ رہا ہوں۔۔۔

بیوی بچوں کے لیے محنت کرنا اور کمانا آزار نہیں فرض ہے

جانتے ہو یہ کاروبار حرام ہے

جب دماغ کا کوئی خلیہ سلامت ہی نہیں تو حلال کیا اور حرام کیا۔۔۔

یار پرندوں کو دیکھو۔۔۔ کیا کبھی تم نے سنا کسی پرندے نے اپنی چونچ سے اپنے بچوں کے منہ میں زہر انڈیلا ہو۔۔۔!

یہ سب باتیں کتابی۔۔۔۔! میں اس سیٹ اپ سے لاکھوں کما رہا ہوں۔ کیبل نیٹ ورک کا پرافٹ الگ اور انٹرنیٹ کیفے میں تو ساری رات میلہ لگا رہتا ہے۔

تمہیں معلوم ہے معصوم بچے ان جانے میں ویب سائیٹس کلک کر کے کیا دیکھتے ہیں۔۔۔؟ چیٹ رومز نے انہیں گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔

مجھے اس سے کیا۔ میری غرض تو گھنٹے میں فی کس پندرہ روپے سے ہے۔ میں انہیں گھر سے بلا کر تو نہیں لاتا۔ اپنی مرضی سے آتے ہیں۔

لیکن جال بچھا کر تو بیٹھے ہو

شکار کی ممانعت تو نہیں ہے

یونس ویر۔۔۔۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے

گفتگو اس وقت رک گئی جب ایک عورت ویڈیو سنٹر میں داخل ہوئی

جو سی ڈی میں نے آپ سے منگوانے کو کہا تھا۔۔۔کیا مل گئی۔عورت نے سوال کیا

جی۔۔۔!بالکل۔۔۔یونس ویر نے ایک پیک سی ڈی خاتون کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔اور اس کی نظریں عورت کے چہرے کی بجائے ادھ کھلے گریبان کی طرف تھیں جہاں فیشن نے موسموں میں ہلچل مچادی تھی

عورت نے سی ڈی کور میں سے نکالی اسے دیکھا اور قیمت پوچھی

پانچ سو روپے۔۔۔یہ Latest ہے

عورت نے کاؤنٹر پر پانچ سو روپے کا نوٹ رکھا سی ڈی پرس میں ڈالی ،ڈرائیور نے کار دروازہ کھولا اور میرے ادر خوف کی کھڑکی کھل گئی۔

اس سی ڈی میں کیا تھا۔۔۔؟

بلیو پرنٹ۔۔۔!

حیا نہیں آئی تمہیں۔۔۔؟

ہو تو آئے۔۔

ایک نوجوان نے ویڈیو سی دی میں قدم دھرا۔وہ کسی کالج کا سٹوڈنٹ لگ رہا تھا۔اس نے ویڈیو سنٹر میں لگے نیم عریاں پوسٹرز کو غور سے دیکھا۔ایک اشتہار کی طرف اشارہ کر کے اس نے پوچھا' اشتہار جس میں رقاصہ کے جسم پر صرف تین انچ کپڑے کی دھجی تھی

کیا یہ نیا گرم مصالحہ ہے۔۔۔؟

بالکل تازہ ہے۔

یہی دے دیں

وہ تو جی ایسے ہے کہ گرم مصالحہ کی ساری سی ڈیز نکل گئیں ۔تم کل آنا میں رکھ لوں گا۔البتہ ایک نئی انگلش موی آئی ہی ''Six Days and Seven Nights''۔۔فلم صاف ستھری ہے۔ایک آدھ سین تو جی ان فلموں میں ہوتا ہی ہے۔

ظاہر ہے راتیں دن سے زیادہ ہیں Six Days and Seven Nights ''۔۔۔!

چلیں وہی دے دیں

گاہک آرہے تھے۔ جارہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی یونس ویر سو رہا تھا میں ڈر رہا تھا وہ سامنے جو شخص آرہا ہے کار سے اتر کر۔۔۔ یہ پروفیسر ہے گزشتہ برس گرمیوں کی چھٹیوں میں اس نے اکیانوے فلمیں دیکھی ہیں۔ اسے سی ڈی لے جانے دو میں تمہیں اس کا کھاتہ کھول کر دکھاتا ہوں ۔ پروفیسر نے سی ڈی کاؤنٹر پر رکھی۔ تعلیم اس کے وجود میں سے رخصت ہو چکی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ہونٹوں پر تیرتے لفظوں میں سے کوئی مہک تلاش کرنے کی سعیٔ لا حاصل سے گزرا۔ بے نور چہرے پر نور کی کرن تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ رشید احمد صدیقی نہیں ہے۔ لیکن یہ میرے اندر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی آواز کیوں ابھری ہے۔۔۔

پروفیسر صاحب۔۔۔! آپ نے گزشتہ صدی میں یہ کہا تھا۔ ''اگر ایک طالب علم تین گھنٹے کی فلم دیکھے تو اس کی شخصیت پر وہ فلم جو منفی اثرات مرتب کرتی ہے اسے زائل کرنے کے لیے کسی بہترین ادارے کے تمام اساتذہ ایک سال تک بھی محنت کریں تو بھی اس فلم کے مضر اثرات پوری طرح زائل نہیں کر سکتے''

پروفیسر صاحب۔۔! یہ تو آپ نے طلباء کے لیے کہا۔ ویڈیو سی ڈی سنٹر میں تو پروفیسر موصوف خود تشریف لائے ہیں۔ ان کے پختہ کردار کو فلم بینی سے کوئی خطرہ نہیں

میں نے بے وقت کی راگنی چھیڑی اور پروفیسر سے پوچھ بیٹھا

آپ کا شعبہ۔۔۔؟

اردو

اپ نے پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی گنج ہائے گراں مایہ کا مطالعہ کیا ہے۔۔۔؟

پروفیسر کی پیشانی پر ہلکا سا پسینہ اترا اور شرم مجھے آئی۔ وہ بغیر سی ڈی لیے پلٹنے لگے تو یونس ویر نے کہا یہ اس شہر میں اجنبی ہیں۔ آپ بلا جھجک سی ڈی لے جائیں

رات ہمارے وجود میں سے گزر رہی تھی۔ میں نے وقت دیکھنے کے لیے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ اپنی آنکھوں کو ہتھیلی سے مسلا اور پھر گھڑی دیکھی۔ خوف سے میرے بال کھڑے ہو گیے۔ دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ یہ کیا۔۔۔؟ گھڑی کی سوئیاں الٹی سمت چل رہی ہیں ۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ ویڈیو سنٹر میں حبس ایک دم بڑھ گیا۔ میں سنٹر سے باہر نکلا۔ گہرا سانس کھینچ کر

پھیپھڑوں میں تازہ آکسیجن کا اہتمام کیا۔اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی ایک بار پھر بے یقینی سے گھڑی پر نظر ڈالی اور دم سادھ لیا۔۔۔

میں کیا کروں۔۔۔؟اس لمحے کس سے کہوں کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے

ہمت کو مجتمع کر کے میں نے ایک شخص کو روکا اور سوال کیا

کیا میں آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔۔۔؟

اس شخص نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور کہا

آپ میرا نام کیوں پوچھ رہے ہیں۔۔۔؟

اس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔بلا وجہ پوچھی جانے والی بے معنی باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔میری بے وقوفی سے لطف لیتے ہوئے اس نے کہا

مجھے خاور چودھری کہتے ہیں

پلیز۔۔۔!آپ وقت بتایئے گا

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو خوف سے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا

اس نے بھی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کو مل کر دوبارہ گھڑی دیکھی اور زیرِ لب بولا

ہیں ں ں ں،۔۔۔یہ کیا۔۔۔؟ سوئیاں الٹی سمت کو کیوں چل رہی ہیں

بھائی وقت پوچھا ہے آپ سے۔۔!

وقت کیسے بتاؤں جی۔۔۔سوئیاں الٹی سمت چل رہی ہیں

میرے اندر کسی نے قہقہہ مارا۔۔۔!

میں نے سامنے دیکھا۔ویڈیو سنٹر کے سامنے سڑک کے اس پار ایک ہوٹل تھا۔اس میں چلنے والے ٹی وی پر تصویر الٹی چل رہی تھی۔۔۔میں نے خاور چودھری کے کندھے پر ہاتھ رکھا

دوست۔۔۔گھبراؤ نہیں۔بات اتنی سی ہے کہ سامنے جو ویڈیو سنٹر ہے اس میں ایک شخص بیٹھا ہے۔اس کا نام یونس ویر ہے۔اس کے دماغ کے سارے خلیے مر گیے ہیں۔یہ مردہ خلیے کا شاخسانہ ہے۔کہ اس نے کوئی ایسا بٹن دبا دیا ہے کہ ہر چیز الٹی سمت چلتی دکھائی دے رہی ہے۔وہ سامنے دیکھو۔۔۔سائیکل الٹا چل رہی ہے۔کار بھی ریورس گیئر میں آ رہی ہے۔انسان بھی الٹا چل رہے

ہیں۔تانگے کو گھوڑا پچھلی سمت دھکیل رہا ہے۔اجنبی کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔۔۔!میرے شہر میں بیٹھا یونس ویر کیسے سارے نظام کو الٹا چلا سکتا ہے۔

خاور چودھری۔۔۔!فضا میں ایک سیارہ ہے جس سے پورا کرۂ ارض منسلک ہے اور ادھر زمین پر یونس ویر حشرات الارض کی طرح پھیل گیے ہیں۔یہ کالے پہاڑی بچھو ہیں۔یہ یاجوج ماجوج قسم کی کوئی مخلوق ہے یہ ایک کان نیچے بچھا لیتے ہیں اور دوسرا اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔یہ رات میں اپنا کام دکھاتے ہیں۔انسانی دماغ کو کریدنا ان کا مشغلہ ہے یہ دماغوں میں 'Terror, Horror' جنس' مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں' بلیو پرنٹ' ڈانس' گانے اور نہ جانے کون کون سی کریہہ Chips فٹ کرتے ہیں اور صبح ہونے پر چھپ جاتے ہیں یہ مخلوق رات میں جاگتی' فساد پھیلاتی ہے اور دن میں سوتی ہے۔

پیمانے بدل گئے تھے

مجھے نہیں معلوم خاور چودھری وہیں کھڑا تھا' یا وہ جا چکا تھا

ایک موہوم سی امید ٹمٹماتی تھی

شاید کہیں کوئی گھڑی وقت صحیح بتلا رہی ہو۔کوئی سائیکل سیدھی سمت جا رہا ہو' کار ریورس گیئر کی بجائے سیدھی دوڑ رہی ہو۔ٹی وی پر تصویر سیدھی اور صاف ہو۔۔۔!

کیا آپ کی کلائی پر گھڑی موجود ہے۔۔۔؟

کیوں کی یونس ویر کی گھڑی کے مطابق سمت ٹھیک ہے اس کا کہنا ہے ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سوئیاں کس سمت کو چل رہی ہیں۔ان کی سمت کا تعین کرنا دانش وروں اور سائینس دانوں کا کام ہے۔ہمارے زائچے میں سمت ٹھیک ہے

مجھے اس ہوٹل میں بیٹھے اک عمر بیت گئی ہے۔مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم میں اس ہوٹل میں انتظار کس کا کر رہا ہوں۔مجھے تو گھر کا رستہ بھی بھول گیا۔ہوٹل کا بیرا میرے سامنے روز اخبار رکھ جاتا ہے

میں شاید اونگھ رہا ہوں

یہ اخبار کی سرخی الٹی چھپ گئی ہے کیا۔۔۔؟

میں نے آئینے کی مدد سے شہ سرخی پڑھی

''کل رات کرۂ ارض کے کئی شہر غرقاب۔لاکھوں انسان لقمۂ اجل بن گیے''

مکاری۔۔۔!

میں خبر پوری نہیں پڑھ سکا کہ میری بینائی میں نمکین پانی حائل ہو گیا۔شاید آپ کو معلوم ہو۔۔؟
آپ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ لیجیے کہیں سوئیاں الٹی سمت تو نہیں چل رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔!

☆☆☆

آخری آئس کیوب

تم چاہو بھی تو اس یقین کو واپس نہیں لا سکتیں جسے تم نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

میں تمہاری تھی ہی کب۔۔۔؟

تو پھر وعدے گرہ میں کیوں باندھے تھے

تم بھول رہے ہو۔تم ایک لمحہ ایسا یاد میں لا دیکھو جس میں تم سے میں نے شادی کا وعدہ کیا ہو۔

لیکن تمہاری ہر ادا میرا یقین تھی

وہ میرے بچپن کی بھول تھی

میری زندگی تم نے ریزہ ریزہ کر دی اور وہ تمہارے بچپن کی ادا ٹھہری۔ مجھے خبر تو کر دی ہوتی کہ تم میرے ساتھ لکن میٹی کھیل رہی ہو۔۔۔اس کے چہرے پر تشنج کی کیفیت تھی۔

بچپن میں تو کتنے بہت سے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔تم بھی مجھے ایک کھیل سمجھ کر بھول جاؤ۔

وہ اسے کہنا چاہتا تھا

وہ تمہاری جنسی تسکین کا سامان تھا۔ایک ایسا سامان جسے تم نے ایک حد تک استعمال کیا۔ بلکہ وہ ٹشو پیپر تھا جسے تم نے استعمال کے بعد وقت کی ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

لیکن وہ خاموش رہا وہ کوئی گری ہوئی بات کہہ کر اپنی محبت کی توہین کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔

گلاس میں اس نے آخری آئس کیوب ڈالا۔۔۔

دور تک اداسی کی چادر بچھی تھی۔ بہت دیر وہ اس اداس منظر میں گم رہا۔ وہ اداسی کی تہہ میں چھپے منظر کو دیکھنے کا متمنی تھا۔اس نے آہستگی سے اداسی کی چادر کا ایک کونا پکڑ کر کھینچا۔ دور تلک اس کے آنسوؤں کے موتی بکھر گئے۔۔۔یہ موتی ہو بہو اس مکیش کے سوٹ کی طرح تھے جو پہلے روز ملاقات پر اس لڑکی نے پہن رکھا تھا۔ جو اس کی زندگی تھی بھی اور نہیں بھی۔ اسی تھی اور نہیں کے درمیاں اس کے وجود کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہ کئی دن سے ان میں سے وہ ٹکڑا تلاش کر رہا تھا جس پر اس کی مکمل کہانی لکھی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ کہانی کا سرا کچے دھاگے کی طرح کب ٹوٹ گیا۔ اسے تو برسوں پہلے کی دیکھی ہوئی ایک فلم کا سین بھی دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔فلم کا سین اس کی یادوں کے پردے پر چلنے لگا۔ ہیرو بہت اکھڑ اور خود سر تھا۔ایک روز اس کی محبوب نے اسے ایک کچے دھاگے سے باندھ دیا۔ وہ باڈی بلڈر تھا لیکن وہ اس کمرے میں اس دھاگے سمیت گھومتا رہا اس دھاگے کو توڑ کر وہ اس دائرے سے نہ نکل سکا جس میں وہ اسے باندھ گئی تھی۔ اس کا ایک دوست جو اس وقت موجود تھا۔۔۔کہا۔۔۔یار یہ کچا سا دھاگہ تم سے کیوں

نہیں ٹوٹ پا رہا۔ تو اس نے کہا تمہیں اس کی مضبوطی کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ مجھے اپنی آواز کے ساتھ باندھ جاتی تو بھی میں بندھا رہتا یہ تو پھر دھاگہ ہے۔

اس نے آہستہ سے قمیض پر لگی سلوری رنگ کی مکیش کو چھو کر دیکھا۔

یہ کھردری مکیش تمہارے بدن کو تکلیف نہیں دیتی

نہیں اس کی چبھن مجھے اچھی لگتی ہے۔۔

کیوں۔۔؟

بس مجھے کھردری چیزیں اچھی لگتی ہیں

یادیں اگر کھردری ہوں۔۔۔؟

ان کے بارے ابھی میں نے سوچا نہیں

تمہیں معلوم ہے تم محبت کو کس مقام پر لے آئی ہو۔۔۔

یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ محبت کیا سوچ کر کی جاتی ہے۔۔۔؟

تم روح اور بدن کے درمیان جو دیوار ہے اس کا قضیہ تو چکا دو۔۔

روح بھی تمہاری ہے اور بدن بھی۔۔۔ میں اپنے بدن کی کسی سرحد پر کوئی پہرہ نہیں بٹھاؤں گی۔

اس نے آہستگی سے اداسی کی چادر کا ایک کونا پکڑ کر کھینچا۔

دور تک یادوں کا سبزہ بچھا تھا۔ اور ننھے ننھے واقعات کے پودے کھلے تھے۔ ابھی وہ منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے بھی نہ پایا تھا کہ پھر اداسی کا کہرا اتر آیا۔ سارا سبزہ اور واقعات کے پودے دھندلا گئے۔

وقت کی چادر سرکی اور اس کا سانس رک گیا

ایک رات میں تمہارے گھر مہمان ٹھہرا تھا۔ یاد ہے یا بھول گئی ہو۔۔۔؟ مجھے آدھی رات کو اپنے پاؤں پر تمہاری انگلیوں اور پھر ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا۔ میری سانس اٹک گئی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اگر کسی کی آنکھ کھل گئی۔ تو میری ساری عمر اکارت چلی جائے گی۔ یاد ہے اس رات میرے پاؤں کی سرزمین پر تمہارے ہونٹوں نے کتنی مسافت طے کی تھی۔ میری البم میں کوئی ایک یاد کسی یاد کو ادھورا لگڑا ہوتا تو میں اسے لاشعور کی اندھیری کوٹھری میں پھینک کر تالا لگا دیا۔۔۔ لیکن تم نے تو پورا شہر بسا دیا۔ اس شہر پر تو میں آنچ بھی نہ آنے دوں۔ کون اپنی سلطنت اپنے ہاتھوں برباد

کرتا ہے۔۔۔؟

شاید تم پلٹ آؤ۔۔۔!

اب یہ ناممکنات میں سے ہے۔ناممکنات کے اس خطے میں میں کسی امکان کو داخل نہیں ہونے دوں گی۔تم اتنا معمولی سا کام نہیں کر سکتے۔۔۔۔

کون سا۔۔۔؟

یہی کہ مجھے بھول جاؤ۔۔۔محبت میں لوگ کیا سے کیا کر گزرتے ہیں اور تم مجھے نہیں بھلا سکتے

تمہیں بھلانا شاید آسان ہوتا۔لیکن کیا کروں ۔تمہارا ایک ایک لمس میرے بدن پر سلگتا ہے اور مجھے سانس لینا عذاب ہو جاتا ہے۔۔۔۔

تم اپنے بدن سے میرے بوسے کھرچ کیوں نہیں دیتے

یہ میرے بس میں نہیں ہے

چلو میں تمہیں ایک طریقہ اور بتاتی ہوں۔۔۔

مکان کا رنگ بوسیدہ ہو جائے تو اسے نیا پینٹ کرا لیا جاتا ہے۔کچھ صاحب ثروت لوگ شوقیہ بھی عمارت دوبارہ پینٹ کرا لیا کرتے ہیں ۔تم ایسے کرو۔تمہارے بدن کی عمارت پر جہاں جہاں میرے لمس اور بوسوں کا پینٹ ہے۔وہاں کسی اور لڑکی سے نیا پینٹ کرا لو

آئیس کیوب گلاس میں ڈالتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپا۔۔۔پانی چھلکا

کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔؟

زندگی کی حقیقت کہہ رہی ہوں تم سے۔۔۔

اس سے آگے ایک لفظ بھی اپنے ہونٹوں کے دروازے پر مت بلانا۔

ایک بار اور۔۔۔

کیا۔۔۔؟

یاد ہے ایک بار میں نے تمہارے لیے جوس لائی تھی۔تمہیں □ تنگ کرنے کو میں نے اس میں نمک ملا دیا

اس کی آنکھ میں ایک نمکین آنسو اترا۔۔۔

اس بات کو رہنے دو

کیسے رہنے دوں

وہ تمہارا مشورہ تھا۔۔۔ میں مان رہی ہوں اور میرا مشورہ تم نہیں مان رہے کہ پینٹ کرالو

میں اپنی وہ بات اس سے پہلے کہ تمہارے ہونٹوں سے ادا ہو۔۔۔ جانا چاہوں گا

بزدل نہ بنو۔۔۔ سنو۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ محبت اور نفرت دونوں ایسے جذبے ہیں جو دل سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے زندگی میں اگر کبھی نفرت کرنے کی نوبت آجائے تو وہ بھی تم مجھی سے کرنا' میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دل سے پھوٹنے والا کوئی جذبہ کسی اور کے نام ہو۔۔

تمہارے چہرے پر جھوٹ لکھا ہے۔

آئس کیوب پانی میں حل ہو چکا تھا۔۔

میرا یہ خیال تھا میں ایک آئس کیوب تھا۔ تمہارے بدن کے گلاس میں جو روح کا مشروب تھا۔ میں اس میں حل ہو چکا ہوں۔۔۔

مجھے صرف اتنا بتا دو۔۔۔ تم اتنا کیوں بدل گئی ہو۔۔۔

میرا اب گھر ہے۔۔۔ خاوند ہے۔۔۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو

لیکن تم نے وعدے کیوں کیے تھے۔۔۔

اچھا بابا۔۔۔ میں اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہوں۔۔۔

وہ غلطی نہیں تھی۔۔۔ میری زندگی تھی

دور تک اداسی کی چادر بچھی تھی۔۔۔ اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور دیکھا کہ رات اتر رہی ہے اور کسی کی مخملیں انگلیوں کا لمس اس کے بالوں میں اس کے نام اپنی ہر سانس لکھتا چلا جا رہا ہے۔

اسے اس کڑی کی تلاش تھی جہاں سے اس محبت میں دراڑ پڑی۔ وہ اس کے دل میں اندر تک اتر کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسے مجھ سے نفرت کیوں ہوئی ہے۔۔۔؟

وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اسے ایسے محسوس ہوا کوئی اس کے اندر رنگ برنگے آئس کیوب ڈالتا جا رہا ہے۔ وہ بے حد اداس تھا۔ اس کی اداسی بانٹنے والی ہی اس سے دور ہو گئی تھی وہ اس کا درد بھی اسی سے بانٹا کرتا تھا اور اپنے بھی اور اب سارے غم سارے دکھ آئس کیوبز میں ڈھل گئے۔ اس کی سرد مہری کے آئس کیوب دیکھ کر وہ سوچنے لگا کیا میرے جسم کے اندر جو روح کو مشروب ہے یہ اس

کی کیمسٹری ہی نہ بدل دیں میں نے تو اپنے اندر اس کی نرم و ملائم یادوں کو ڈیکوریٹ کیا تھا۔۔۔عجیب پاگل ہے۔کہتی ہے نیا پینٹ کرالو۔

اس کی آوارگی اس کے اندر ہی رہی۔اس نے سارے دروازے بند کر دیے۔اندر ہی اندر وہ گھلنے لگا۔اس کی ہر کاپی ہر کتاب وہی تھی۔اس کی کالج کا فائل کور اور فائل میں لگے کاغذ میں وہی تھی۔اس کے دل میں' گھر پر' سڑک' پارکوں میں' کار چلاتے ہوئے' بستر پر جاتے ہوئے شام سویرے سارے کے سارے موسم وہی تھی۔

ایک دن تنہائی میں بیٹھ کر اس نے اپنے آپ کو پرکھا تو اپنی محبت میں اسے کہیں دراڑ نظر نہ آئی۔اس نے اس نے اپنے آپ سے اتنے سوال کیے کہ بے حال ہو گیا۔

یاد کی دھند سے ایک چھوٹی سی کرن نکلی۔۔

ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔۔۔؟

تم یہ مت بھولا کرو کہ تم ہر بات پوچھ سکتی ہو۔۔

قرب کے لمحات میں تم ایک حد پر آ کر ٹھہر کیوں جاتے ہو

شیکسپیر نے کہا ہے کہ محبت ایک پاکیزہ پھول ہے جو گناہ کی دھوپ سے مرجھا جاتا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے بعد شیکسپیر کو کون خاطر میں لاتا ہے۔۔۔۔

اتنی بے باک گفتگو تمہارے منہ سے اچھی نہیں

تم سیاچین گلیشیر ہو۔۔برف۔۔۔ٹھنڈے ٹھار' میں تمہیں نہیں پگھلا سکی۔۔۔جانے وہ کون خوش نصیب ہو گی جو تمہیں مکمل حاصل کر لے گی۔

کہا نا۔۔۔اس طرح کی بات تمہارے منہ سے۔۔۔!

کوئی اور بات کہو

انسان گناہ کی حد سے گزر جائے نا تو سب سے پہلے وہ اپنی نظروں میں گر جاتا ہے۔

تم زندگی کے گرم لمحات میں یہ سرد فلسفہ کہاں سے لا ڈالتے ہو

ایک بات کہوں۔۔۔

کہو

شادی کے بعد بھول جاؤ گی۔۔۔؟

کچھ کہہ نہیں سکتی۔لمحۂ موجود میں تمہاری ہوں میں۔۔۔مکمل تمہاری۔تم مجھے پورا کا پورا کیش کر لو۔کل آنے والا تمہیں کیش نہ کرانے دے تو پھر مجھے نہ کہنا۔

لیکن میں کیا کروں۔۔۔؟ جب بھی ایک حد سے آگے گزرنے کی سوچتا ہوں۔محبت کی عمارت زمین بوس ہوتی دکھائی دیتی ہے

ایک تو یہ تمہارے فلسفے تمہیں لے بیٹھے ہیں۔۔۔بزدل ہوتم۔۔۔یہ کرو وہ نہ کروایسا نہ ہوجائے ویسا نہ ہوجائے۔۔۔!

میں نے پوچھا ہے شادی کے بعد بھی یادرکھوگی کیا۔۔۔؟

کیسے وعدہ کرسکتی ہوں۔شادی کے بعد عورت کے مسائل بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

مجھے بھی ایک مسئلہ سمجھ کراپنے دل میں رکھ لینا۔

لیکن خاوند کی موجودگی میں تمہیں حل کیسے کروں گی۔

جیسے آئس کیوب مشروب میں حل ہوجاتا ہے

مجھے تمہارے ماں باپ کی عزت عزیز ہے

اور میں۔۔۔۔؟

تم نہیں سمجھوگی۔۔۔۔میں صرف اپنی یاد کے البم میں وہ یادیں سنبھال کر رکھنا چاہتا ہوں۔جو زندگی کے تنہا لمحوں میں میرا ساتھ نبھائیں۔گناہ آلود یادیں عذاب ہوتی ہیں۔عمر بھر کی پھانس بن جاتی ہیں۔میں اپنے من میں کوئی پھانس رکھنا نہیں چاہتا

کتنے موقعے تم نے گنوادیے۔۔۔!

کوئی موقع نہیں گنوایا میں نے۔۔۔۔سب سنبھال رکھا ہے۔

اس کے سر میں درد کی ایک شدید ٹیس اٹھی

اس نے گھڑی دیکھی رات کے دو بجے تھے۔اس کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پر پانی کا گلاس رکھا تھا۔اسے گلاس اٹھاتے ہوئے اس کی نظر فون پر پڑی۔۔۔پھر اداسی کی دھند چھا گئی

رات گیے تک میرے ساتھ وہ فون پر باتیں کیا کرتی تھی۔۔۔ہنسنا' کھلکھلانا' باتوں کے سرے پکڑ کر رات گیے تک کھینچا تانی۔۔۔کیا مجھے آخری حد سے گزر جانا چاہیۓ تھا۔۔۔؟ وہ اس حد سے کیوں گزرنا چاہتی تھی۔۔۔۔

اسے یاد آیا۔۔۔

ایک بار اس کی قمیض کا بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگی بٹن لگا دوں۔۔۔۔؟

بٹن کی بجائے کوئی یاد ٹانک دو

تم بہت دیر گھر میں وہ بٹن تلاش کرتی رہی۔ جب اسے نہیں ملا۔ تو وہ روہانسی ہو کر کہنے لگیں

اب میں کیا کروں۔۔۔۔؟

کہا ہے نا۔۔۔اپنی کوئی ادا ٹانک دو

نہیں۔۔۔۔ٹھہرو۔۔۔ایک منٹ۔۔۔ایک آئیڈیا۔۔۔!

یہ کہہ کر تم نے اپنے ململ کے کرتے سے ایک بٹن توڑا۔۔۔تمہاری قمیض کے منقش گلے پر نفیس کڑھائی تھی اور سامنے سفید رنگ کے تین بٹن تھے۔ تم نے ململ کے کرتے کا بٹن توڑا۔ سوئی پکڑی اس میں تاگہ ڈالا اور میری کف میں بٹن لگا دیا۔

چلو ایسے کرو جہاں سے میں نے تمہارے لیے بتن توڑا ہے تم وہاں اپنے ہونٹوں سے ایک یاد کا بٹن ٹانک دو نہیں تو یہ خالی گریبان اچھا نہیں لگے گا۔

ایسی ہی یادوں کے سہارے زندہ رہنے کا سوچا تھا اس نے۔

اس نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھایا۔ اسے معلوم تھا۔ باقی کی رات مجھے اس کی یادوں کی چٹائی پر ہی گزارنی ہے۔ وہ ویسے بھی اب زبردستی نیند لانے کی مشقت سے نہیں گزرتا تھا۔

تم چاہو بھی تو اس یقین کو واپس نہیں لا سکتیں جسے تم نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

پھر وہی کیوب۔۔۔برف' گلاس' یادوں کے ٹکڑے۔۔۔!

ایک ہی عذاب۔۔۔شادی کے بعد ایک روز اس نے اسے چھونا چاہا تو وہ یوں تڑپی جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔۔۔یہ ایسا غیر متوقع عمل تھا کہ اسے سکتا ہو گیا۔۔۔وہ تو اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اس کے گریبان میں اپنی ساری سانسیں رکھ کر اس کی زندگی میں یقیں رقم کیا کرتی تھی وہ تو پہروں اس سے الگ نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس کی باتیں عجیب دل آویز ہوا کرتی تھیں

ایک کام تو کرو۔۔۔

کہو۔۔۔

اپنی زبان کی نوک سے یاد کا ایک آویزہ تو میرے کانوں میں ڈال دو

اس کے کانوں میں آویزوں کی جگہ میری یاد تھی۔اس نے انگلیوں میں انگوٹھیوں کی جگہ میرے ہونٹوں کا لمس پہن رکھا تھا۔اس کی ناک میں جو کوکا ہے وہ میری زبان کی نوک کے لمس کی انمٹ یاد ہے۔

یہ ہوا کیا۔۔۔شادی کے بعد سارے منظر کیوں بدل گئے

یہ اتنی گنجلک کیوں تھی کہ میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔میں جو اسے اپنا سب کچھ مان بیٹھا اور وہ۔۔۔؟

یہیں آ کر اس کی سوچ ادھڑنے لگتی۔۔۔سوچ کی روئی کے گالے وہ اچھالتا ور اپنے آپ سے الجھتا۔اور سوال کرتا تو کیا اس شام جب وہ اپنی وسیع وعریض کوٹھی میں اکیلی تھی اور اس نے کہا تھا

آج تو سرحد کے پار اتر جاؤ

یہی ایک نقطہ اسے ہمیشہ عذاب دیا کرتا تھا

کیا یہ لمس کے چھوٹے چھوٹے ٹکرے کافی نہیں ہیں۔

تم نہیں سمجھو گے۔۔۔عورت جب لمس سے گزرتی ہے تو وہ کسی بھی سرحد کو خاطر میں نہیں لاتی۔

لیکن اس کا انجام سوچا ہے تم نے۔۔۔

کچھ نہیں ہوگا۔۔

تم پاگل ہو

یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ میرا پاگل پن دور کرو

یہ مجھ سے کبھی نہیں ہوگا

بزدل

مجھے یہ بزدلی گوارا ہے

ایک بات تو بتاؤ

یہ جو میں تمہاری بانہوں میں کتنی دیر سمائی رہتی ہوں یہ گناہ نہیں ہے

چپ۔۔۔!

اور یہ جو تم نے اپنی یادوں کے انگنت لمس میرے بدن پر پینٹ کر ڈالے ہیں یہ گناہ نہیں ہے۔اگر تمہیں اتنا ہی گناہ کا خیال ہے تو پھر مجھے ملنے کیوں آتے ہو۔۔۔؟

گناہ کے گراف میں فرق ہوتا ہے

کوئی فرق نہیں ہوتا

پانی کا گلاس خالی تھا۔۔۔وہ اٹھ کر فرج تک گیا۔وہاں سے ٹھنڈی بوتل نکالی۔غٹا غٹ پانی پیا۔ساری تھیوریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔جب وہ چاہتی تھی اس وقت اس کے سامنے شیکسپیر کا فلسفہ تھا اور اب اسے اس کی طلب ہوئی تو وہ جانے کیوں اسے عذاب دینے پر تل گئی ہے۔حالاں کہ اب کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔

کیا وہ ایک خواب تھی ایک دھوکا۔۔۔ایک بزنس جو فلاپ ہو گیا

کیا وہ میرے ساتھ سیکچول بزنس ڈیل کرتی رہی۔۔۔؟

میری تو وہ انوسٹمنٹ تھی۔۔۔اگر وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تو میں تو اپنے بزنس سے بھی گیا۔۔۔کیا محبت ایک بزنس ہے۔۔۔؟اس نے مجھے اپنی وقتی جنسی تسکین کے لیے استعمال کیا۔۔لیکن آخری حد تو میں نے پار نہیں کی اس نے تو مجھے کئی بار پہلے پہل اشاروں کنایوں میں اور پھر شرم کی چادر اتار کے دعوت دی۔۔۔اسے تو مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرنی چاہئے تھی۔کہ میں نے اس کی عزت کا خیال رکھا

کیا وہ تحائف کا کاروبار تو نہیں تھا۔قیمتی تحائف مجھ سے وصول کرتی رہی

اس نے سوچا ہو۔۔کاٹھ کا الو' مل گیا۔۔۔اگر یہ سب بزنس تھا تو میں نے اسے کیش کیوں نہیں کرایا میں کیا کروں۔۔۔

اگر میں نے محبت کو آلودہ نہیں کیا تو اب میرے سر میں یہ کیسا سودا سمایا ہے کہ میں اس کے ساتھ آخری حد سے گزرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔!

وہ تکیہ گود میں رکھے اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس کے انگوٹھوں پر رات اتر آئی اور کسی کے نرم ہونٹ سفر کرنے لگے

وال کلاک نے تین گھنٹیاں بجا کر اس کے خیالات کو منتشر کر دیا

مجھے بس ایک سوال کا جواب چاہئے۔۔۔اس نے مجھے نظر انداز کیوں کیا۔مجھ میں کیا کمی ہے۔۔؟

اس کا پورا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا

ہوش کے ناخن تلاش کرنے میں اسے بہت دیر لگی۔۔۔۔وہ پھر اٹھ کر فرج تک گیا اس فرج کھول کر ٹھنڈے بوتل نکالی۔۔۔پیپسی کا ڈھکن ہوا میں اچھالا۔۔۔گھونٹ گھونٹ اسے حلق سے اتار کر

سوچنے لگا۔
میرے اندر کمی کس چیز کی تھی۔۔۔؟
میں نامرد بھی تو نہیں تھا۔۔۔ پھر۔۔۔؟ شادی کے بعد اسے ہوا کیا ہے۔۔۔؟
اس کی شادی پر میں نے دل کھول کر پیسہ لٹایا۔ ساری راتیں میں نے وہیں گزاریں۔ زندگی کی ہر خوشی میں اس کا ساتھ دیا۔ شادی کے بعد بھی تو میں نے اسی حد میں رہنا تھا، اسی سرحد پر اس سے ملاقات کا سامان کرنا تھا جہاں شادی سے پہلے ملا کرتا تھا۔۔۔ لیکن اس نے تو ایک ہلکا سا لمس بھی برداشت نہیں کیا۔۔۔ میرے چھونے سے یوں ہاتھ جھٹکا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔
شاید اسے زندگی میں کسی بچھو کی ہی تلاش رہی ہو۔۔
فون کی گھنٹی پر وہ چونکا۔۔۔ CLI پر اسی کا نمبر تھا۔۔
اب یہ کیا چاہتی ہے۔۔۔؟
جب بات ہی ختم ہو گئی۔ اب راکھ میں کیا رکھا ہے۔۔۔؟ کیا میں فون اٹھا لوں۔۔۔؟
لیکن کس لیے۔۔۔؟
باب ہی بند ہو گیا
شاید کوئی رمق باقی ہو
جانے کتنی دیر گھنٹی بجتی رہی۔ وہ خلا میں گھورتا رہا۔ اس کا محبت' بے لوث جذبوں سے ایمان اٹھ گیا تھا۔ وہ ایک بے اعتبار وجود تھا جو دیوار پر اپنے ہی عکس دیکھتا اور اپنے آپ سے الجھتا تھا۔ میں نے ساری زندگی اس آس میں یادوں کی کٹیا بنائی کی عمر آرام سے کٹے۔ لیکن وہ تو یوں بھول گئی جیسے ایک رات میرے پاؤں پر بھول کر رات بھر کہانی لکھتی رہی تھی۔ مجھے بھول جانا بھی اس کی ادا ٹھہری۔ مجھے زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اس دنیا میں کتنے برے بڑے سانحات گزر جاتے ہیں۔
وقفے کے بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی
اس نے بادلِ ناخواستہ فون اٹھایا۔۔
فون کیوں نہیں اٹھا رہے۔۔۔؟
اس نے ریسیور بات کیے بغیر واپس رکھ دیا۔ اس کے اندر کی توڑ پھوڑ نے اسے اس حد تک دل

برداشتہ کردیا تھا کہ ساری یادیں اوراس کی وہ ادائیں جواس نے آج تک سنبھال کررکھی تھیں۔وہ انہیں کہیں
چھینک آنا چاہتا تھااس کے ساتھ گزری سارے وقت کی کرچیاں اس کے لیے سوہانِ روح بن گئیں
کیااس سے انتقام لیناچاہئے۔۔۔؟
اس کے اندرانتقام نے زوردارانگڑائی لی۔اس کے تراشیدہ جسم نے اسے پھراندھا کردیا۔اسی کی نظر دھندلانے لگی۔مجھے انتقام لے لیناچاہئے۔ساری عمر کی آگ سےتو بہتر ہے۔ایک ہی دفع اس مرحلے سے گزرجاؤں۔۔۔!

(۲)

تمہیں اس کی شادی کی کوئی فکرنہیں ہے
مان نہیں رہا
کیسے نہیں مانے گا
ہربات میں زبردستی نہ کیا کریں اولادجوان ہوجائےتو اسے ڈانٹنا چاہئے اورنہ ہی اس پرہاتھ اٹھانا مناسب ٹھہرتا ہے۔۔۔!
کوئی رشتہ ہےتمہاری نظرمیں
رشتوں کی کیاکمی ہے۔۔۔وہ ہاں توکرے
وہ تیارہوکرکہیں نکل رہاتھا۔۔
بیٹا۔۔۔ایک منٹ بیٹھو
امی۔۔۔مجھے پہلے ہی دیرہوگئی ہے
بیٹا۔تمہاری شادی کی عمرنکل جائے گی۔
امی۔۔۔میں کوئی لڑکی نہیں
پھربھی بیٹا۔۔۔؟

امی میری کوئی پسند نہیں

تو پھر میں اپنے طور پر کوشش کروں

ایسی بھی کیا جلدی ہے

بیٹا۔۔۔

امی مجھے اجازت۔۔۔۔دیرہ ہورہی ہے

اس نے گاڑی نکالی

ٹریفک کے رش میں اس کے اندر اس کی یاد کا ایک کیوب گرا اور وہ پھر بے ترتیب ہو گیا

شادی کیسے کرلوں میں۔۔۔شادی کر لینے سے میرے جسم پر نیا پینٹ ہو جائے گا اور نئے پینٹ کے ہونے سے پرانا رنگ خود مجھ کو نظر نہیں آئے گا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل جائے تو شاید شادی بھی میرے لیے آسان ہو جائے۔ مجھے نفرت کے اس چشمے کو تلاش کرنا ہے جس نے میری محبت کو زہر آلود کر دیا۔۔۔اس کا خاوند اگر مجھ سے زیادہ وجیہہ ہوتا' خوبصورت ہوتا تو بھی میں مان لیتا۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟ اگر مجھے نظر انداز ہی کرنا تھا۔ تو پھر اتنی بہت سے یادیں تعمیر کرنا ضروری تھا کیا۔۔؟

میں شادی ہرگز نہیں کروں گا

اسے مسلسل سر کا درد رہنے لگا تھا اس کا ذہن منتشر تھا۔ اب کئی روز گھر میں شادی کی باتیں ہوتی رہیں گی۔ ایک میری شادی نہ کرنے سے کون سا نظام رک رہا ہے۔ ساری زندگی فیصلے مسلط ہوتے رہتے ہیں اگر شادی نہ کی جائے تو کیا زندگی نہیں گزر سکتی۔ اب میں کسے جابتاؤں کہ ذہن میں اگی یادوں کا عذاب کیا ہوتا ہے۔ ایسے معاملات کسی سے بانٹے بھی تو نہیں جاسکتے۔

کتنے باتیں کتنے وعدے۔۔۔؟۔۔۔ ہر ملاقات پر پیار کی موسلا دھار بارش کے بعد کیسے قوسِ قزح کی طرح رنگ اس کے چہرے پر پھیل جاتے تھے۔ کیسی عجیب لڑکی تھی۔ اتنے برسوں میں ایک بار بھی تو اس نے اندازہ نہیں ہونے دیا کہ وہ یہ کھیل کیوں کھیل رہی ہے۔ کیا انسان اتنا بھی بدل سکتا ہے کہ برسوں کی یادوں کو ردی سامان کی طرح پھینک دے۔ اس نے ایک بار کہا تھا۔

تم غم کیوں کرتے ہو، جب ایک بار کہہ دیا ہے میں تمہاری ہوں۔ یہ کوئی سیاسی اور حکومتی فیصلے نہیں جو نظریہ ضرورت کے تحت بدل لیا جائے

لیکن وہ بھی حکومت کی طرح بدل گئی۔

میں شادی نہیں کروں گا۔۔۔یہ آخری فیصلہ اس نے اپنے آپ کو سنایا اور لیٹ گیا

(۳)

وہ دسمبر ایک سرد صبح تھی۔وہ لان میں دھوپ اور کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ملازم نے آ کر اسے کہا

صاحب۔۔۔آپ کا فون ہے

کس کا فون ہے۔۔؟

کوئی خاتون ہیں

اسے کہہ دو میں گھر پر نہیں ہوں۔۔۔

ٹھیک ہے صاحب

ٹھہرو۔۔۔۔اس نے ملازم کو کارڈلیس فون لانے کو کہا

کیسے ہو۔۔۔؟

جی۔۔۔فرمایئے۔اس کا لہجہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔

میں کل کی فلائیٹ سے پہنچی ہوں۔۔۔کل لنچ سیر ون کیفے میں میری طرف سے۔۔۔!

تم میری زندگی سے نکل چکی ہو

جھوٹ بھی بولنے لگ گئے ہو۔مجھے تمہاری الجھن دور کرنی ہے۔مجھے اب تم پر ترس آتا ہے

مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے

کہیں سے پینٹ تو نہیں کرالیا

میں ایسی فضول باتیں سننا بھی اب گوارا نہیں کرتا

بہت بڑے بزنس مین ہو گئے ہو۔۔نا۔اب تو اکثر سنا ہے بیرونِ ملک دوروں پر رہتے ہو۔

یہ بے کار کی باتیں چھوڑو۔۔۔میری نجی زندگی پر گفتگو کا تمہیں کوئی اختیار نہیں

تو کل سیر ون کیفے آ رہے ہو۔۔۔نا۔۔۔؟

آ جاؤں گا

اس نے فون بند کر دیا۔۔۔اس کے سامنے ایک بار پھر سارے منظر کھل گئے

دور تک اداسی کی چادر بچھی تھی ۔ بہت دیر وہ اس اداس منظر میں گم رہا۔ وہ اداسی کی تہہ میں چھپے منظر کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس نے آہستگی سے اداسی کی چادر کا ایک کونا پکڑ کر کھینچا۔ دور تلک اس کے آنسوؤں کے موتی بکھر گئے۔۔۔ یہ موتی ہو بہو اس مکیش کے سوٹ کی طرح تھے جو پہلے روز ملاقات پر اس لڑکی

نے پہن رکھا تھا۔ جو اس کی زندگی تھی بھی اور نہیں بھی۔ اسی تھی اور نہیں کے درمیاں اس کے وجود کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہ کئی دن سے ان میں سے وہ ٹکڑا تلاش کر رہا تھا جس پر اس کی مکمل کہانی

لکھی ہوئی تھی۔

ویٹر ان کے سامنے گلاس رکھ گیا۔ ماحول خواب ناک تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں موسیقی گھلی ہوئی تھی۔ اس کے خاوند نے کھانے کا آرڈر دیا۔ وہ مکیش کے اسی سوٹ میں آئی تھی جس میں اس کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

کھانے پر وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے

نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے شریکِ سفر کے ساتھ خوش اور مطمئن ہے۔

کھانے پر وہ ماضی کی کوئی نہ کوئی یاد ایسی یاد کھول لیتی جس پر اس کے خاوند کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا

تھا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کچھ زیادہ ہی جڑ کر بیٹھی تھی۔ کھانے کے دوران وہ مسلسل یہی سوچتا رہا

اس نے مجھے کیوں بلایا ہے۔۔۔؟

باتوں کے دوران اس نے ایک آئس کیوب پیپسی میں ڈالتے ہوئے ایک بات زور دے کر کہی

تمہاری طرح انہیں شیکسپیر کے مطالعے کا کوئی شوق نہیں۔۔۔ یہ عملی آدمی ہیں

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کے اندر ایک چھپا کا ہوا۔۔۔ ماضی کرلایا

میں ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔۔۔؟

پوچھو۔۔۔!

تم ایک حد پر آ کر ٹھہر کیوں جاتے ہو

شیکسپیر نے کہا ہے محبت ایک پاکیزہ پھول ہے جو گناہ کی دھوپ سے مرجھا جاتا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے بعد ان پابندیوں کو کون خاطر میں لاتا ہے۔۔۔
اس نے مکیش کا سوٹ ایک نظر دیکھا
کھردری یاد ابھری
اس کی آنکھوں میں اس نے جھانک کر دیکھا تو اس کا خاوند مکمل کیوب کی صورت میں اس کی آنکھوں میں تحلیل ہو چکا تھا۔۔۔!
آخری آئس کیوب جانے اس نے گلاس میں کب ڈالا تھا۔۔۔؟ یہ اسے یاد نہیں تھا

لیکن جب وہ شیکسپیر کا فلسفہ اوڑھ کر ہوٹل سے نکلا تو اس کے پورے بدن پر مکیش کے بوسے ناسور میں بدل چکے تھے۔

☆☆☆

کتنے مہر دین

یہ کہانی پہاڑی رستوں کی طرح کئی موڑ لے گی۔ اس کہانی کا ٹریک اور منظر آپ کا جانا پہچانا اور

مانوس ہے۔ یہ کہانی اپنی مٹی سے پھوٹی ہے اور ایسی زہرناک کہانیاں پھوٹتی رہتی ہیں۔ سفر کے دوران گرد و پیش پر نظر رکھیے گا' منظر بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ابھی پہاڑی سفر کے دوران پھولی ہوئی سانس بھی بحال نہیں ہوتی کہ خبر آتی ہے رات کی تاریکی میں پورا منظرنامہ بدل گیا۔ صبح آنکھ کھلنے پر نئے چہرے اگ اتے ہیں۔ آپ کو ایسی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو ہمیں اس کہانی کا سرا پکڑنا ہے اور سرا پکڑنا دہشت گردوں کی طرح آسان ہے کیا؟ آنکھ مچولی کا کھیل جاری ہے۔ ہر کھیل کا نتیجہ نکلنے میں وقت تو لگتا ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کون دہشت گرد تھا۔ لیکن ہماری اس کہانی میں دنیا کی کسی بھی تنظیم کا کوئی دہشت گرد نہیں ہے۔ بلاخوف و خطر اس کہانی کا مطالعہ کیجئے۔ جب آپ کہانی مکمل کر لیں گے تو اس وقت تک امید کی جا رہی ہے کہ رزلٹ نکل آئے گا۔ گو نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہے گا لیکن تھوڑی دیر کہانی پڑھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ ہم اور بھی تو اتنے بہت سے کام یونہی کر لیا کرتے ہیں۔

دیکھیے یہ ایک گاؤں کا منظر ہے۔

ستو دونوں گھٹنوں میں بالٹی پھنسائے گائے کا دودھ نکال رہی ہے۔ وقفے وقفے سے وہ دودھ کی دھاروں کا رخ بالٹی کی بجائے گائے کے منہ کی طرف کر دیتی ہے۔ گائے ہونٹ چاٹنے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ یہ جو ستو اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بمشکل اٹھی ہے اور بالٹی لیے جا رہی ہے یہ اس کا بڑھاپا ہے۔ نہیں معلوم یہ عمر گزار چکی ہے یا عمر سے گزر گئی ہے۔

وہ جب اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ مہر دین کے کھوہ پر آئی تھی تو ایوب خان کا عہد تھا۔ اور مشرف کے عہد تک آتے آتے وہ زمانے کا سرد و گرم گزار چکی تھی۔ جب وہ آئی تھی تو اس کا جسم گائے کی دودھ کی طرح سفید اور مکھن کی طرح چکنا تھا۔ اس کا یہ خیال خام ثابت ہوا کہ وہ سدا جوان رہے گی کیوں کہ فوجی حکومت تو لمبے عرصے تک جوان رہ سکتی ہے لیکن انسان کو تو کہولت آ لیتی ہے۔ وہ جب پہلی بار گائے کا دودھ نکال کر اٹھی تھی تو اس کی ناک کی بائیں جانب ننھی سا چمکیلا کوکا اور کانوں میں بندے تھے۔ مہر دین کئی روز سے کھوہ پر آ رہا تھا۔ ایک روز مہر دین نے پانی پلانے کے بہانے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ اتھری گھوڑی کی طرح پاؤں پٹختی اندر کمرے میں چلی گئی۔ اسے مہر دین سے گھن آئی وہ اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اسے مہر دین کی نظریں اپنے پنڈے میں کھبتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس روز وہ انہی زہریلی نظروں کی ڈسی آدھا دودھ نکالے بالٹی اٹھائے جب کمرے

میں گئی تو اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔مہر دین کے حقے کی گڑ گڑاہٹ کی آواز اسے زہر لگ رہی تھی۔

زمینوں کا مالک ہے تو کیا ہوا۔۔۔؟ میں اس کی رکھیل نہیں بنوں گی،جس کھوہ پر جاؤ یہ سالے وہاں ڈسنے کو موجود ہوتے ہیں۔غریب کی تو عزت ہی نہ ہوئی نا۔جب جی چاہا رکھ لیا اور جب جی اوبھ گیا نکال دیا۔

بابا۔۔۔حکومت پھر بدل رہی ہے۔۔۔مہر دین نے حقے کی نال منہ سے الگ کرتے ہوئے کہا

ہاں چودھری جی۔۔۔یہ کھیل تو ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔اوپر ہی اوپر کھیلے جاتے ہیں۔ہماری زندگی تو ان جانوروں میں انہی کی طرح گزر جاتی ہے۔ہمیں کیا خبر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔جو پتہ لگ وی جائے تو ہم نے کون سا تیر مار لینا ہے۔ہمیں تو تڑکے تڑکے بیلوں اور زندگی کو ہانکنا ہے۔حکومت کی بات چھوڑیں جی۔نہر سوکھ گئی ہے' کل فصل کو پانی لگانے کے لیے ٹیوب ویل نہ چلا لیں

ہاں ہاں۔۔۔بالکل

بابا سویرے سویرے چلانا' میں نے کپڑے بھی دھونے ہیں۔ستو بولی

ستو کے کپڑے دھونے کا سن کر مہر دین کے اندر بیٹھے شیطان نے بھرپور انگڑائی لی اور وہ ستو کے گیلے کپڑوں سے جھانکتے بدن کا چوبیس گھنٹے پہلے ہی لطف لینے لگا۔ستو اس کے حواس پر ایسی سوار ہوئی کہ وہ اسے ہر صورت میں حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔اس کے دماغ میں جتنے بھی ہرکارے تھے الیکشن کے دنوں کی طرح اس نے انہیں آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔الیکشن جیتنا تو اس کے لیے کوئی ایسا مشکل مرحلہ نہیں تھا۔مدِ مقابل کو مروایا جا سکتا ہے۔ووٹ خریدے بھی جا سکتے ہیں۔بیلٹ بکس اٹھا کر بھاگنا بھی کوئی ایسا جانگسل مرحلہ نہیں۔شناختی کارڈ حاصل کر کے انگوٹھے لگائے جا سکتے ہیں۔جو دنیا سے گزر گئے ان کے شناختی کارڈ بھی با آسانی استعمال ہو سکتے ہیں لیکن ستو کوئی الیکشن تو نہیں ہے جسے آسانی سے جیت لیا جائے۔وہ تو ایک دھڑکتا وجود ہے۔اسے اٹھا کر گھر میں ڈال لینا بھی مشکل نہیں تھا لیکن مہر دین اسے ایم این اے کی سیٹ کی طرح مستقل اپنے پاس رکھ کر اس سے لطف اٹھانا چاہتا تھا۔

عید کے روز ستو سوتیلی ماں کے ساتھ مہر دین کے گھر آئی تو اس کی بیوی کو دیکھ کر اسے سکتہ ہو گیا۔ اس نے ایک نظر پلٹ کر اپنے وجود پر ڈالی اور پھر کن اکھیوں سے مہر دین کی بیوی کو دیکھا۔ بادامی آنکھ' ستواں کھڑی ناک' سونے کی گانی گردن میں' دونوں کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں' رنگت دودھ سے بھی اجلی' پاؤں میں پائل اور ملتانی کھسہ' ہاتھوں میں رچی مہندی اور پانچ انگوٹھیاں' ستو اسے تکتی ہی رہ گئی۔ وہ سوچنے لگی اتنی خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے انہیں جانوروں کی طرح ادھر ادھر منہ مارنے کی عادت کیوں ہے؟ ستو مہر دین کی بیوی کا زیور دیکھنے میں ایسی مگن ہوئی کہ اسے اس کا حسن بھول گیا اور وہ زیورات میں ہی کھو کر رہ گئی۔

زیورات آہستہ آہستہ وہ اپنے بدن پر سجانے لگی۔ پہلے اس نے کانوں میں بڑے بڑے جھمکے ڈالے' گانی اور پھر کنٹھا لا' دونوں ہاتھوں میں سونے کی بارہ بارہ چوڑیاں ڈال کے انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ یہ میں ہوں ستو۔۔۔؟ یا کوئی اور ہے۔ میں یونہی اپلے تھاپتی اور زندگی برباد کرتی رہی۔ اک ذرا سی دیر میں کیسے زندگی بدل گئی۔

وہ اس وقت چونکی جب اس کی ماں نے اسے مہر دین کی بیوی کے کہنے پر برتن دھونے کا کہا۔ برتن مانجھتے مانجھتے وہ اندر سے ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ برتن دھوتے ہوئے ہاتھ میں سے صابن پھسل کر گرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

مہر دین نے میٹرک میں فیل ہونے کے بعد ہی سیاست میں قدم رکھ لیا۔ امتحان اور سیاست کا فرق اسے آباء واجداد سے ورثے میں ملا۔ میٹرک کے بعد آوارہ گردی سے بچانے کے لیے اس کے باپ نے زمینیں اس کے حوالے کر دیں۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے دوران ایک دراز قد گٹھے ہوئے بدن والی عورت نے اسے اپنے بدن میں لپیٹ لیا۔ وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ یہ اس کی گناہ آلود زندگی کا پہلا باب تھا۔ وہ جلد ہی اس باب سے اکتا گیا۔ اسے خیال آیا اب کوئی اور باب پڑھنا چاہئے۔ دولت کی ریل پیل ہو تو ایسے اسباق میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔

وہ نت نئی عورت کی تلاش میں رہنے لگا ور اس کے باپ کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اسے شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے منہ کو گناہ کے خون کی چاٹ لگ گئی وہ شکاری کتوں کی طرح پگڈنڈیوں پر گنے کے کھیتوں میں کپاس کی کھڑی فصل میں ہر جگہ اپنے شکار کی تلاش میں رہنے لگا۔ موقع پاتے ہی وہ شکار کو دبوچ لیتا۔

باپ کی خونخوار مونچھوں کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال کر شادی کر لی۔ اس کی منکوحہ ساتھ کے گاؤں سے انہی جیسی فراعینی برادری میں سے تھی۔ سہاگ رات میں اس نے کمرے میں قدم دھرا تو بھینی بھینی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ یہ خوشبو پگڈنڈیوں کی خوشبو سے یکسر مختلف تھی۔ گھونگٹ الٹنے کی دیر تھی۔ اسے حیرت نے آلیا۔ کیا اتنی مکمل اور خوبرو عورت میری بیوی ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی۔ چپٹی ناک قدرے موٹے ہونٹ رنگ گہرا سانولا اور مسلسل سگریٹ نوشی سے پیلے دانت۔ اکہاں میں اور کہاں یہ کپاس کی طرح نرم اور ملائم میری بیوی' کیا یہ مجھے قبول کرلے گی۔۔۔؟ حالاں کہ وہ اسے قبول کر چکی تھی۔۔۔نہیں نہیں یہ مجھے قبول نہیں کرے گی ۔میرے ساتھ اس کا نبھاہ مشکل ہوگا۔ یہ کسی اور کے ساتھ تعلقات نہ پال لے۔ اس کے اندر وہم نے انگڑائی لی۔

گھونگٹ الٹتے ہی اس نے بیوی کے سینے میں ایسا تیر پیوست کیا جو ساری عمر ناسور بن کر رستا رہا۔ ایک ایسا فقرہ جو مکمل زہر آلود تھا۔ اور اس کا پورا زہر اس نے بیوی کے وجود میں انڈیل دیا۔

یہ پہلی رات ہے۔ یاد رکھنا اگر زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور تمہارے بستر پر آیا تو میری طرف سے تین طلاق۔۔۔ اس کی آواز بھاری اور جذبات سے خالی تھی۔

اسے یوں محسوس ہوا اس کی پوری زندگی زمین بوس ہوگئی۔ منہ دکھائی کی اتنی بڑی قیمت۔۔۔؟ پوری رات حیوانوں کی طرح وہ اس کا جسم بھنبوڑتا رہا۔ اور کروٹ لے کر سو گیا۔

الیکشن کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ مہر دین کی کوٹھی پر بڑی چہل پہل رہنے لگی۔ علاقے کی کئی ٹیکسیاں جن کے ڈرائیور دن بھر اڈے پر سواری کے انتظار میں تاش اور تو گیٹی کھیلتے رہتے تھے انہوں نے اپنی ٹیکسیوں پر مہر دین کے نام اور انتخابی نشان پینٹ کرا لیے۔ ان کے لیے بابِ رزق کھل گیا۔ مہینے بھر کی بچت ان کے لیے ایک ایسا اطمینان تھی جس سے وہ اپنی گاڑی کی مکمل مرمت اور گھر کے چھوٹے موٹے رکے ہوئے کام نکال سکتے تھے۔ انہیں پٹرول اور ڈیزل کی فکر بھی دامن گیر نہیں تھی کیوں کہ سچ ہی صبح مہر دین کا منشی انہیں ٹینکی بھروانے کے لیے مہر دین کی دستخط شدہ چٹ پکڑا دیتا۔

الیکشن کے دنوں میں ستو وقتی طور پر پسِ منظر میں چلی گئی۔ ایک وقت میں ایک ہی الیکشن لڑنا ممکن تھا۔ وہ اپنے سیٹ کے لیے تگ و دو میں تھا اور ادھر ستو کے اندر زیور نے ایسی جڑ پکڑی کہ وہ

مہر دین کے لیے بے قرار رہنے لگی۔ حویلی میں رہنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ سارا دن چائے اور کھانے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ ستو نے مہر دین کی سیٹ سے پہلے اسے جیت لیا۔

مہر دین نے اپنی بیوی کے دل میں جو طلاق کا بیج ڈالا تھا اس کا خوف اسے بے چین رکھنے لگا۔ اسے زندگی سے اکتاہٹ ہونے لگی بیزاری اس کے رگ و پے میں رچتی چلی گئی۔ جس روز مہر دین نے الیکشن جیتا۔ سارا دن ڈھول اور شہنائیاں بجتی رہیں۔ سارا دن وہ مبارک باد دینے والوں میں گھرا رہا۔ وہ لوگ بھی مبارک باد دینے چلے آئے جنہوں نے اسے ووٹ نہیں ڈالا تھا۔ ہر آنے والا خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مہر دین کے قریب بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے منشی کو ہدایات جاری کیں کہ ٹیکسی ڈرائیوروں کو بہترین کھانا کھلایا جائے اور ان کو فوری ان کی محنت کے چیک دیے جائیں۔

ستو کے ساتھ وہ اس کی پہلی رات تھی۔ اگلی صبح اسے دارلخلافہ پہنچنا تھا۔ اس کے ذہن میں موجود مسائل وقتی طور پر ستو کے جسم میں چھپ گئے۔ ستو نے اس سے الیکشن کی خوشی پوری پوری وصول کی۔ ستو کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دونوں الیکشن جیت چکا ہے۔

کہا تھا۔۔۔ نا ابھی پہاڑی سفر میں پھولی ہوئی سانس بھی بحال نہیں ہوتی کہ خبر آتی ہے رات کی تاریکی میں پورا منظر نامہ بدل گیا۔ صبح آنکھ کھلنے پر نئے چہرے اگ آتے ہیں۔ مہر دین جب دارلخلافہ پہنچا تو وہاں اس کی حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی جب ان نے وہاں ممبران سے علیک سلیک کی تو ہر ممبر کا نام مہر دین تھا۔ ایک دو ناموں میں تو مماثلت ممکن تھی لیکن یہ کیسے ہو گیا کہ سارے ہی مہر دین نکلے۔ اس نے متعدد ممبران سے ہاتھ ملایا۔ اسے یوں لگا سب ستو سے مل کر آ رہے ہیں۔ ان سب میں ایک شخص سب سے الگ تھلگ بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر مہر دین کی تختی نہیں تھی۔

یہ کون ہے۔۔۔؟ کہاں سے آیا ہے۔۔۔؟ یہ اپنی ستو کیوں ساتھ نہیں لایا۔۔؟ مہر دین اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس کے اندر بے شمار سوال بے قابو گھوڑے کی طرح زبان کی زمین پر دوڑنے کو تیار بیٹھے تھے۔

آپ کا تعارف۔۔۔۔؟

مجھے احمد دین کہتے ہیں۔۔۔!

آپ چودھری ہیں' ٹوٹوانے' ہراج' سید' ملک۔۔۔یا۔۔۔!

وہ شخص مسکرایا۔۔۔مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی

میرے نام کے ساتھ کوئی سابقہ لاحقہ نہیں ہے۔

میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ اپنے نوکروں کو ساتھ لائے ہیں یا نہیں۔سابقہ لاحقہ یقینی طور پر آپ کے ملازمین یا باڈی گارڈز کے نام ہوں گے۔

وہ شخص پھر مسکریا۔۔۔

عجیب شحص ہے۔صرف مسکرانے پر اکتفا کرتا ہے

میں آپ کی تعلیم پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟

میں نے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد اپنی مزید تعلیم کے لیے جرمنی کی ایک یونیورسٹی کا انتخاب کیا ہے۔۔۔!

تو گویا آپ ان پڑھ نہیں ہیں

نہیں

تو پھر یہاں اسمبلی میں کیا لینے آئے ہیں۔۔۔؟

ملک کی قسمت سنوارنے۔۔!

یہ اسمبلیاں چلانا پڑھے لکھے لوگوں کا کام نہیں ہے۔چوں کہ اس ملک کی اکثریت ناخواندہ ہے اس لیے اسے صرف ہم ہی سمجھ اور چلا سکتے ہیں۔ہمیں معلوم ہے جہالت کیا ہوتی ہے۔۔۔لیکن یہ آپ الیکشن میں جیت کیسے گئے۔۔۔؟

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہونے والے اس الیکشن میں کچھ بوریا نشین' درویش اور مولوی بھی حصہ لے رہے تھے۔میں نے سوچا مجھے بھی قسمت آزمانی چاہئے۔شاید ہماری دھرتی کی تقدیر سنور جائے۔اس دھرتی میں اچھے لوگوں کی کمی بھی نہیں ہے۔اچھے اور مخلص لوگ نہ ہوتے تو زمین الٹ گئی ہوتی۔ہمیں امید کا دامن کسی بھی لمحے ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ہر اندھیرے میں روشنی کی ایک نہ ایک کرن موجود ہوتی ہے۔جو ایک روز پورے

اندھیرے کو نگل جاتی ہے۔

مہر دین کو یقین ہو گیا کہ یہ ممبر عوام کی بے وقوفی کی وجہ سے اسمبلی میں پہنچ گیا ہے۔اس نے یہاں

کون سے تیر چلا لیتے ہیں۔اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ علاقے کی سڑکیں کیسے پکی کرا کے نوٹوں کی طرح ووٹ سمیٹے جاتے ہیں۔اسے تو یہ بھی خبر نہیں ہوگی کیسے بجلی کے خالی کھمبے لگوا کر بجلی کے جھوٹے وعدوں پر سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔اس تعلیم یافتہ نے تو کبھی بجلی بھی چوری نہیں کی ہوگی اسے کیا معلوم لاکھوں روپے کی بجلی کیسے چوری کی جاتی ہے اور پھر بڑے آرام سے سیدھے سبھاؤ عوام پر ٹیکس لگا کر حساب سیدھا کر لیا جاتا ہے۔

وہ اس کے ساتھ اسمبلی کے لان سے کینٹین تک آیا۔چائے کے دوران باتیں ہوتی رہیں۔مہر دین کو احمد دین سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔اس نے احمد دین کو اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی۔اور اس بات پر اصرار کیا کہ آپ مجھے بہت بھائے ہیں اس لیے باہم رابطہ رہے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔احمد دین کے جانے کے بعد اسے پھر ستو کی یاد آئی۔وہ سوچنے لگا یہاں اتنے بڑے شہر میں رات کیسے کٹے گی اور یہاں تو آنا بھی اب معمولاتِ زندگی کا حصہ ہے۔یہاں بھی ایک ستو کا ہونا ضروری ہے۔وہ سوچ رہا تھا جس چیز کی چاٹ لگ جائے اسے چھوڑنا مشکل ہوتا ہے شراب ہو عورت یا سیاست۔۔۔!

بہت دنوں بعد وہ گاؤں لوٹا تھا۔اپنی لینڈ کروزر پر اس نے سیر کا پروگرام ترتیب دیا۔ڈرائیونگ کے دوران اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔رات میں اس کی بیوی نے ایک ایسے موضوع پر اس سے بات چھیڑی کہ اسے لاجواب کر کے رکھ دیا۔وہی بات اس کے ذہن سے نکالے نہیں نکل رہی تھی۔بات کھل کر کہہ دی گئی ہوتی تو اسے سلجھانے کا راستہ نکال لیتا۔لیکن اس کی بیوی نے اسے ادھوری بات کے عذاب میں ڈال دیا تھا۔رات ابھی تک اس کے وجود سے چپکی ہوئی تھی۔

تم نے پہلی ہی رات طلاق کا کہہ کر مجھے عذاب میں ڈال دیا ہے۔مجھے اپنے وجود سے نفرت ہوگئی ہے۔خاوند اگر محبت عزت اور وقار نہ دے سکے تو کم سے کم اسے عذاب بھی نہیں دینا چاہیے۔جانے تم لوگ شادی کیوں کرتے ہو۔تمہیں جنسی تسکین کے لیے کتنی ہی عورتیں مل جاتی ہیں تو پھر ایک عورت کو کیوں باندھ کے رکھنا چاہتے ہو۔۔۔؟ ہمارا کیا قصور ہے۔۔۔؟ کیا یہ معاشرہ صرف مرد کا ہے۔کیا ہماری طرح تم لوگوں کی عزت داغ دار نہیں ہوتی۔دولت کیوں تم سب کو کالے کرتوتوں کے باوجود صاحب توقیر بنائے رکھتی ہے۔میں نے تو تمہارے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ایک

رات تو صبر کر لیا ہوتا۔ مجھے آزما تو لیا ہوتا۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔

تم کون ہوتی ہو اپنا فیصلہ کرنے والی۔۔۔؟ مہر دین کی آواز میں غصے کی آمیزش تھی

مہر دین۔۔۔ مجھے معلوم ہے مشرقی عورت کا اپنے خاوند کو نام لے کر پکارنا اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن مہر دین میں کیا کروں۔ میں نے مجبوری میں یہ فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اب ہم بھی اسمبلی میں پہنچ گئی ہیں۔ اگلے کسی بھی دورانیے میں اگر تعلیم کی پابندی مزید بہتر اور سخت کر دی گئی تو تم سارے کے سارے مہر دین باہر بیٹھے رہ جاؤ گے۔

بیوی کے لہجے پر اس کو خون کھولنے لگا۔ اسے احمد دین اور اس کی تعلیم اور مستقبل کا ہیولا بھی نظر آیا لیکن سرِ دست وہ گھر میں الجھا ہوا تھا۔ گھر کی اسمبلی اس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔

تو کیا تم کسی طریقے سے اسمبلی میں آواز اٹھاؤ گی۔۔۔؟

نہیں۔۔۔

پریس کانفرنس کے ذریعے مجھے رسوا کرنے کا ارادہ ہے تمہارا۔۔۔؟

نہیں۔۔۔

میرے خلاف کتاب چھاپ کر مجھے پوری دنیا میں ننگا کر کے قہقہے لگاؤ گی۔۔۔؟

بالکل ہی نہیں۔۔۔!

تم نے جو کرنا ہے کر لو۔۔۔

لینڈ کروزر کے سٹیرنگ پر اس کی گرفت سخت ہو گئی۔ اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔ ارادہ تو اس کا ستو کی طرف جانے کا تھا لیکن سینے میں بائیں جانب اٹھنے والے درد نے اسے ہر چیز بھلا دی۔ باڈی گارڈ نے سیٹ سنبھالی اور اسے فوری ھسپتال لے جایا گیا۔ دل کا دورہ شدید تھا۔

بیماری کے دوران وہ زیادہ تر نوکروں کے رحم و کرم پر رہا۔ اس کی بیوی کی سرد مہری نے اسے اندر سے چور چور کر رکھا تھا۔ ایک ہی سال میں دل کے دورے کے بعد اسے فالج نے آلیا۔ وہ بستر کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ اسمبلیاں، زمینیں اور عورتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ موت سامنے کھڑی تھی اور زندگی بھر کے اعمال حشرات الارض کی شکل میں اسے نوچنے لگے تھے۔ ایک تسلی کے سہارے وہ بستر پر سانس لے رہا تھا کہ بیوی کو میں نے جس انداز میں پہلی رات باندھ لیا تھا اب کم سے کم وہ تو آزاد نہیں ہو سکتی۔ لیکن رات گیے اس کی آنکھ کھلتی تو بیوی کی دل خراش آواز اس کی سماعت پر

برسنے لگتی۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔

فیصلہ کرنے کی بجائے اگر سنا دیا ہوتا تو میں اس عذاب سے تو نہ گزرتا۔ یہ عذاب تو دل کے دورے اور فالج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ روح اٹکی ہے میری۔۔۔!

ناشتے میں ایک ملازم اسے دلیہ کھلا رہا تھا۔ اس کی بیوی لاؤنج سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی انداز بتا رہا تھا کہ وہ تیار ہو کر کہیں نکل رہی ہے۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پوچھا کہاں جا رہی ہو۔۔۔؟

عدالت میں۔۔۔!

کیوں۔۔؟

خلع کی درخواست دینے اور ہاں کل رات ستو آئی تھی تمہاری رکھیل۔ اسے میں نے کہہ دیا ہے کہ مہر دینوں کی اسے کیا کمی ہے۔ تمہاری بجائے کوئی اور مہر دین تلاش کر لے۔

رکو۔۔۔ یہ تو بتاؤ تم خلع کیوں لینا چاہتی ہو۔ تم تو کسی کو بھی چھوکر آزاد ہو سکتی تھیں۔

مجھے اپنی عزت بہت پیاری ہے۔ میرے بستر پر آج تک کوئی نہیں آیا۔

تو پھر خلع۔۔۔؟

میں نے احمد دین سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔۔!

☆☆☆

راوی خاموش ہے

ایک چیخ اباخیل کے کچے گھر سے نکلی۔
رات کی یخ بستہ تاریکی میں ایک دراڑ ڈالتی وہ اوپر آسمان کو اٹھی۔
اور چیخ کی بازگشت میں صدیاں مدفون تھیں۔
ایک لڑکی اوندھی لیٹی ہچکیاں لے رہی تھی۔اور ہر ہچکی اس کے بدن سمیت اس کی روح کو بھی لرزاتی تھی۔وہ باہر کی ہچکی کو تو کسی بھی تسلی کے سامان سے روک لینے کا بندوبست کر لیتی لیکن اندر کے لرزے کو روکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔وہ اس دن کو کوس رہی تھی جس روز اس نے جنم لیا تھا۔اس نے ان معصوم لڑکیوں کو بھی یاد کیا جن کو زندہ در گور کر دیا جاتا تھا۔اسے وہ صحابی بھی یاد آئے۔جس نے اپنی بیٹی کو زندہ دفن کرنے کا واقعہ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رقت طاری ہوگئی۔
جو دروازہ چودہ سو سال پہلے بند کر دیا گیا تھا۔اسے پھر کیوں کھول لیا گیا ہے۔۔وہ اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔
معاشرہ تو ابھی وہیں کھڑا ہے۔۔۔دورِ جاہلیت میں' کچھ بھی تو نہیں بدلا۔۔۔!وہ سوچتی رہی
فرق کیا ہوا۔۔۔۔؟اس عہد میں بیٹی کو زندہ در گور کر دیا جاتا تھا۔اور آج مجھ سے بھی میرے ماں باپ نے زندہ رہنے کا حق چھین کر مجھے سوچوں کی اندھی قبر میں ڈال دیا ہے۔وہ وقت کب آئے گا جب مجھے بھی فیصلے کا اختیار دیا جائے گا اس کرب اور عذاب کے ساتھ مجھے ابھی اور کتنی صدیاں پاٹنی ہیں۔۔۔؟
مجھ سے تو میرے بچپن کی خوشیاں بھی چھین لی گئیں۔گڑیاں پٹولے کھیلتے کھیلتے میں نے بھی ایک خواب اپنے اندر سجایا تھا۔ابھی تو ایک تعبیر بھی نہیں نکلی تھی اور خواب کو ہی قتل کر دیا گیا۔
خوابوں کا قتل کسی عدالت میں کیوں درج نہیں ہوتا۔۔۔؟
اس پر سزا کیوں نہیں سنائی جاتی۔۔۔۔؟

میں اپنے خواب لے کر کس عدالت میں جا مقدمہ درج کراؤں۔۔۔؟

ایک چیخ ابا خیل کے کچے گھر سے نکلی۔

رات کی یخ بستہ تاریکی میں ایک دراڑ ڈالتی وہ اوپر آسمان کو اٹھی۔

چیخ کی بازگشت میں صدیاں مدفون تھیں۔

اور ایکبیاسی سالہ بوڑھے کی جھریوں بھری ہتھیلی پر ہیرا دھرا تھا۔

وہ جوہری نہیں تھا۔ پھر بھی ہیرے کی چمک اس کی آنکھیں خیرہ کیئے دے رہی تھی۔ وہ مٹھی کھولتا اور بند کرتا تھا۔ اسے یہ شعور بھی نہیں تھا کہ اتنے قیمتی ہیرے کا مصرف کیا ہے۔۔۔؟ وہ ایک اجڈ دیہاتی تھا۔ لیکن ہیرا اسی کا تھا۔ اور اب اسے اس ہیرے کو استعمال میں لانے کا پورا حق حاصل تھا۔

اس نے بند مٹھی کھولی۔ ہیرے کو غور سے دیکھا۔۔۔

ہیرا اپنی ہیئت تبدیل کر رہا تھا۔ اس کی نظریں ہیرے پر ٹکی تھیں۔ ہیرا اس کی ہتھیلی پر پگھلنے لگا۔ ہیرا ایک سولہ سالہ لڑکی میں ڈھلنے لگا۔ نقوش ابھرتے چلے گئے۔ وہ حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ شہد اور مکھن سے گندھی وہ لڑکی اس کی منکوحہ تھی۔

اور میانوالی جہاز چوک سے پولیس کی گاڑیاں ایک زناٹے دار آواز کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ پولیس کی گاڑیوں کے ٹائروں کی چرچراہٹ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ راہ گیر اپنا اپنا کام چھوڑ کر آواز کی جانب متوجہ ہونے لگے۔

سائرن بجاتی گاڑیاں جب سٹی تھانے سے نکلیں اور بلوخیل روڈ کا موڑ کاٹا تو ایک ریڑھی والے سے گاڑی ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ پولیس عجلت میں تھی۔

عطاء اللہ کنڈی اسی وقت اپنے گھر کے سامنے سانول ویڈیو سے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی نئی آڈیو کیسٹ لے کر گھر جانے کی بجائے بلوخیل روڈ کی طرف مڑ گیا۔ اس نے جہانگیر الیکٹرانکس کے سلیم خان سے پوچھا یار۔۔۔ یہ پولیس کی گاڑیاں اتنی تیزی میں کدھر کو جا رہی ہیں۔۔۔؟

یار کچھ خبر نہیں۔۔۔

کوئی وقوعہ ہو گیا ہے کیا۔۔۔؟

اللہ ہی جانے۔۔!

لوگ ایک ایک کر کے جمع ہو رہے تھے۔ چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔

عطاء اللہ کنڈی جو مائل بہ فربہی تھا۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے سلیم خان سے اجازت لی اور النا صر فوٹوز کا رخ کیا۔ اسے یقین تھا کہ نصرت اللہ خان ناصر کو ضرور خبر ہو گی۔ ناصر کی دکان کو شہر میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اور تعلقات کے حوالے سے اس کی ملنساری ضرب المثل تھی۔

بلوخیل روڈ سے النا صر فوٹوز تک آتے آتے عطاء اللہ کنڈی کی سانس پھول چکی تھی۔

وہ سارا راستہ یہی سوچتا رہا۔۔۔

کیا کوئی اہم شخصیت قتل ہو گئی ہے۔۔۔؟ کیوں کہ خاندانی دشمنی کی بنیاد پر میانوالی کی سرزمین خون بہانے کے حوالے سے خاصی زرخیز تھی۔ اور یہاں قتل کے واقعات معمول کا حصہ تھے۔

کہیں ڈاکہ پڑا ہے کیا۔۔۔؟ ڈاکہ زنی کی واردات بھی کبھی کبھار ہو جاتی تھی۔

عطاء اللہ کنڈی سوچنے لگا۔

کندیاں موڑ پر لوٹی گئی گاڑی تو کل کی بات ہے۔ پھر یہ وقوعہ کہاں ہوا ہے۔۔۔؟

سٹی تھانے میں بند وہ قیدی بھی اس بات سے بے خبر تھے جن کو پولیس نے ایک ہفتہ قبل جوئے میں پکڑا تھا۔ اس واقعے کا سرا ان دو عورتوں سے بھی نہیں جڑتا تھا جو زرگر کو چکمہ دے کر زیور لے اڑی تھیں۔ ایک نمکو شاپ پر لگایا جانے والا یہ الزام کہ وہ سموسوں اور پکوڑوں میں گدھے کا گوشت ملاتے ہیں قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ تو پھر ہوا کیا ہے۔۔۔؟

یہی سوچ ہر شہری کو ہلکان کرتی تھی۔

اور ان ہلکان ہونے والوں میں عطاء اللہ کنڈی بھی تھا۔ وہ بڑا خوش لباس اور ہنس مکھ تھا۔ اب وہ سر ہلاتا اور اپنے آپ سے الجھتا جا رہا تھا۔ کیوں کہ اس کا گھر سٹی تھانے والی گلی میں تھا۔ اور ایک پولیس والے سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ پولیس والا دراصل اس کا کلاس فیلو تھا۔ شام ڈھلے جب عطاء اللہ کنڈی اجلے کپڑے پہنے پرفیوم لگائے بازار کو نکلتا تو کہتے ہیں جن دنوں اس پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی تو کسی نہ کسی چک کے پیچھے سے آواز آتی۔۔۔ پتلا ڈھولا اللہ جانڑیں کیندے نصیب ہوسی

لیکن آج تو عطاء اللہ کنڈی کو وقوعہ ہلکان کئے دے رہا تھا۔

اور شادی کے بعد پتلا ڈھولا اب مسائل کے چنگل میں تھا۔

میں جب کل شام بازار کو نکلا تھا۔تو پولیس والے سے میری ملاقات ہوئی تھی۔اس نے تو کوئی خبر نہیں دی تھی۔

وہ الناصر فوٹوز کے قریب پہنچ چکا تھا اور میانوالی جہاز چوک سے پولیس کی گاڑیاں ایک زناٹے دار آواز کے ساتھ گزر رہی تھیں۔پولیس کی گاڑیوں کے ٹائروں کی چرچراہٹ فضا میں ارتعاش پیدا کررہی تھی۔راہ گیر اپنا اپنا کام چھوڑ کر آواز کی جانب متوجہ ہونے لگے تھے۔

ناصر خان اپنی دھن میں مگن گاہکوں کے ساتھ مصروف تھا۔

یار۔۔۔ناصر۔۔سٹی تھانے سے پولیس کی بہت سی گاڑیاں اکٹھے نکلی ہیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔۔۔

کیں ویلے تے اس نگوسانوی دکان چوں باہروی نکلا کر۔۔۔(کسی وقت تو اس بدبخت دکان سے باہر بھی نکلا کر)

میں بھا۔۔لیناں۔۔(میں آگ لگا تا ہوں)میانوالی کا روایتی فقرہ کہتے ہوئے ناصر خان ہنسا کیوں کہ اسے عطاء اللہ کنڈی کی ناراضگی کا ڈر بھی تھا۔

وہ اس واقعے کا کوئی سرا تلاش کررہے تھے اور پولیس کی گاڑیاں ابا خیل کے قصبے میں داخل ہو چکی تھیں۔کچے راستے پر دھول اٹھتی تھی اور اپلے تھاپتی عورتیں مڑ کر دیکھتی تھیں۔ایک بچہ نل سے منہ لگائے غٹاغٹ پانی پی رہا تھا وہ ننگے پاؤں گاڑی کے پیچھے بھاگا۔

بیاسی سالہ بوڑھے کی ہتھیلی میں ہیرا بند تھا۔

پولیس کے سامنے اس نے اپنی سی مزاحمت کی لیکن اسے گرفتار کر کے حوالات میں لا پھینکا گیا حوالات میں شدید حبس تھا۔قیدی قمیصیں اتار کر بیٹھے تھے اور کچھ نے اپنے پورے گریبان کھول رکھے تھے۔ویسے بھی ایک اوباش طبقہ یہاں گریبان کھلا رکھنا بہادری کی علامت سمجھتا تھا۔بیاسی سالہ بوڑھے کے ساتھ اور قیدی بھی تھے۔جو مجرم پہلے سے حوالات میں بند تھے۔ان کو معلوم تھا کہ میانوالی کے نواحی قصبات موسیٰ خیل'ابا خیل'کلمیری'سہراب والا'روکھڑی'موچھ اور کئی دیگر قصبات میں پورے پورے خاندان بے جا ضد'ہٹ دھرمی اور منتقم مزاج افراد کے ہاتھوں سولی چڑھ گئے۔

رات گئے تک ٹائروں کی چرچراہٹ سنائی دیتی رہی اور ایک ہی خاندان کے دس بارہ افراد کو

حوالات میں لا پھینکا گیا۔ سب کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ بے بس تھے۔ پوری انتظامیہ چوکس تھی۔
یہ انتظامیہ کو کس نے چوکس کر دیا۔۔۔؟ ان کو خوابِ خرگوش سے کس نے جگا دیا۔ اچھے بھلے سو رہے تھے اور نظام بھی چل رہا تھا۔

حوالات میں حبس تھا۔

اور قیدیوں کے اندر بھی حبس تھا۔ جب حبس بڑھنے لگا تو وہ باہم لڑنے لگے۔

حوالدار نے ان کو ڈانٹا۔۔۔ اوئے الودے پٹھو۔۔۔ چپ کرو

تو بکواس نہ کر۔ یہاں سے نکلنے دے تجھے بھی وردی سمیت بھون دیں گے۔ بوسکی کا لمبا کرتا پہنے ایک نوجوان نے کہا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ سارے غصے سے بھن رہے تھے۔
قتل کی صلح میں سات رشتے طے ہوئے تھے۔ اور ایک ہیرا بیاسی سالہ بوڑھے کے حصے میں آیا تھا۔
یہ کوئی نئی بات ہے کیا۔۔۔؟ ہمارے اندر صدیوں سے صلح کا یہی طریقہ رائج ہے۔ رشتے طے ہوتے ہیں تو صلح پکی ہوتی ہے۔ یہ تو قتل و غارت گری کو روکنے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک اور نوجوان نے سرخ لال ہوتے ہوئے اپنا نقطہِ نظر بیان کیا۔
سوال یہ ہے کہ چیف جسٹس تک یہ خبر پہنچائی کس نے۔۔۔؟ ایک پختہ عمر شخص نے میانوالی کا روائتی بیڑہ تھوکتے ہوئے کہا۔ چیف جسٹس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے بیڑے کا بھی فکر تھا کیوں کہ تھوکنے کے بعد اس نے جب سلوری رنگ کی آئینے والی ڈبی سے نسوار کی آخری چٹکی پیلے دانتوں اور کالے ہونٹوں کے درمیان رکھی۔ تو ایک پہلے سے موجود قیدی نے کہا۔۔۔
کاش ہم نسوار بیڑے کی بجائے غصہ تھوکنے کو معمول بنا لیتے تو ہمارا مقدر کب کا سنور چکا ہوتا۔

تو چپ کر اوئے۔۔۔ ماما

تو چیف جسٹس تک خبر کس نے پہنچائی۔۔۔؟

کسی انگریزی اخبار میں خبر چھپی اور صبح ناشتے کی میز پر چیف جسٹس کی نظر پڑ گئی۔ اور اس نے فوری ایکشن لے لیا۔ اسی لئے تو پوری انتظامیہ بھاگ رہی ہے۔ ان کی پتلونیں ڈھیلی ہوگئی ہیں۔۔۔

چپ کرتے ہو یا نہیں۔۔۔؟ حوالدار نے ان کو پھر ڈانٹا

وہ حوالدار کی ڈانٹ سے بے پرواہ اپنی باتوں میں مگن رہے۔

ایکشن ہمارے خلاف ہی کیوں لیا گیا۔۔۔؟

صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان میں بھی تو اس طرح کی رسمیں ہوتی رہتی ہیں۔بس نام بدل جاتا ہے اور چہرے!

یہ جو ونی کی رسم ہے۔اس میں آخر قباحت کیا ہے۔۔۔؟ونی تو عزت کی علامت ہے۔

پہلے سے موجود قیدی نے سگریٹ کا لمبا کش لیا

اوئے۔۔اللہ سے ڈرو۔اس قبیح رسم کے دھاگے تو عزت سے نہ جوڑو

تو بک بک سے باز نہیں آئے گا۔بوسکی کی قمیص والا طیش میں اس پر جھپٹا

میانوالی کے علاوہ پنجاب کے کئی اور علاقوں میں بھی یہ رسم اسی طرح صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔اوئے یہ چیف جسٹس کو ہمارا ابا خیل ہی کیوں نظر آیا۔۔۔؟بیڑے کی پیک پھینکتے ہوئے پختہ عمر شخص نے کہا

بیاسی سالہ بوڑھے کی مٹھی میں ہیرا بند تھا۔وہ ایک کونے میں الگ تھلگ بیٹھا تھا۔

سٹی تھانہ میانوالی کی قدیمی عمارت کی دیواروں پر تاریکی اتر آئی تھی اور جو اندر تھے ان کا مقدر بھی تاریک تھا۔

چمگادڑیں پھڑ پھڑاتی ہوئی عمارت سے رات کی تاریکی میں جست بھرتیں اور لوٹ کر پھر دیواروں سے آٹکراتیں۔قریب ہی کسی درخت میں الو بول رہا تھا۔

اور اس کی آواز ابا خیل کے ایک گھر میں گھومتی تھی۔

ایک معصوم لڑکی اپنی ماں کے پہلو میں ہی سہم کر سو گئی تھی۔وہ پچھلی کئی راتوں سے نیند میں ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھتی تھی۔

وہ آ رہا ہے۔۔۔اسے روکو۔۔وہ مجھے کچا چبا جائے گا۔۔ماں اس کے پاؤں الٹے ہیں۔رال ٹپک رہی ہے اس کی۔۔۔اس کے دانتوں میں یہ کس کا لہو ہے۔۔؟یہ کون ہے۔۔۔؟وہ چلاتی اور اپنے بال کھسوٹتی تسلی دینے کو ماں اسے سینے سے لگاتی۔

وہ سینے سے الگ ہوتی اور اس کی چیخیں کمرے میں ہی دم توڑنے لگتیں۔ماں۔۔ماں ں ں ں۔۔۔میرا جی چاہتا ہے میں اپنے اس انگوٹھے کو کاٹ کر آگ میں پھینک دوں جس کو پکڑ کر زبردستی کاغذ پر لگایا گیا۔ماں۔۔وہ لوگ اچھے تھے جو اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔وہ اس عذاب سے تو نہیں گزرتی تھیں۔ماں۔۔بول نا

مجھے کیوں اس بڈھے کے پلے باندھ دیا گیا۔ میرا قصور کیا ہے۔۔۔؟ ماں وہ قتل تو میرے پیدا ہونے سے بھی بہت سال پہلے ہوا تھا۔ اس قتل کی سزا میرے حصے میں کیسے آ گئی۔۔۔؟ نہیں آتی ۔۔نہیں آتی ماں وہ سزا میرے حصے میں کسی بھی طرح نہیں آتی۔۔۔ میرے اللہ میری آواز اس کمرے سے نکل کر تجھ تک پہنچ رہی ہے نا۔۔۔ ماں کیوں تعلیم دی تھی۔ مجھے کیوں سکول میں داخل کرایا تھا۔۔۔؟

چپ کر۔۔۔۔اس کی ماں حواس باختہ ہو رہی تھی۔ ماں کب تک۔۔۔ آخر کب تک حوا کی بیٹی کو چپ کرایا جاتا رہے گا۔

رو رو کر وہ ہلکان ہو چکی تھی۔

اور سٹی تھانہ میانوالی کی قدیمی عمارت کی دیواروں پر تاریکی اتر آئی تھی

اور جو اندر تھے ان کا مقدر بھی تاریک تھا۔

چمگادڑیں پھڑ پھڑاتی ہوئی عمارت سے رات کی تاریکی میں جست بھرتیں اور لوٹ کر پھر دیواروں سے آٹکراتیں۔ قریب ہی کسی درخت میں الو بول رہا تھا۔

سب طلاق ناموں پر دستخط کر چکے تھے۔ بجز اس بوڑھے کے جسے ہیرا گنوانا گوارا نہ تھا۔

اور اسے کھلی کچہری میں انتظامیہ کے کہنے پر گھاس پر پولیس نے لمبا کر دیا۔

عطاء للہ کندی نے موٹر سائیکل ایک بوڑھے یوکلپٹس کے ساتھ کھڑی کی اور ناصر خان کے ساتھ آگے بڑھا۔۔۔۔ سارا شہر امڈ آیا تھا۔

بابا۔۔طلاق پر دستخط کر دے۔ ہماری اور بے عزتی نہ کروا۔۔۔ اس کے ایک گبھرو پوتے نے کہا ابا۔۔ میں نے بھی تو دستخط کر دیئے ہیں۔ گھر نہ اجاڑ۔۔

اوئے تو بکواس نہ کر۔۔ جو تیرے نکاح میں آئی تھی وہ تجھ سے دس سال بڑی تھی۔

مجمع کھلکھلا کر ہنسا۔۔۔۔!

یہ بابا طلاق نہیں دے گا۔۔۔ مفت میں ہاتھ آئی کون چھوڑتا ہے۔

پولیس والے نے چھتر ہوا میں تولا اور اس کی پیٹھ پر جمایا ابھی دو کی گنتی ہی ہوئی تھی کہ وہ بلبلا کر بولا ۔۔۔ میری بات سنو سپاہی نے ہاتھ روک لیا میں طلاق نہیں دیتا۔۔

راوی کا کہنا ہے کہ اسے اسی طرح لمبا رہنے دیا گیا گھاس پر۔۔۔ اور عدالت کی عمارت کی

دیواریں جن کا رنگ سرخ تھا ان پر سورج کی آخری کرنیں اپنا پیغام لکھ رہی تھیں جو کسی کتاب میں درج نہیں تھا۔

اور ایک بیاسی سالہ بوڑھا نڈھال قدموں سے جا رہا تھا۔

اس کی مٹھی سے ہیرا زبردستی چھین لیا گیا تھا۔

وہ ایک خبر تھا۔۔

پورے منظرنامے کی شہ سرخی۔۔۔!

وہ اپنے بوسیدہ پنجر پر بیکار دماغ لئے قدم گھسیٹ رہا تھا۔

ہوس اس کے اندر ابھی تک انگڑائیاں لے رہی تھی

وہ گھر پہنچا۔۔۔۔

سانس لیا۔۔۔گھڑونچی پر رکھے گھڑے سے کٹورا پانی کا چڑھایا۔

اندر کمرے میں آیا۔

دیوار کے ساتھ ایستادہ دونالی بندوق اتاری اس میں سرخ رنگ کے دو کارتوس ڈالے جو اس کی منتقم آنکھوں طرح گہرے سرخ اور شعلہ بار تھے۔اس نے بندوق پر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔ اس کی مونچھوں تلے شیطانی مسکراہٹ اٹھلائی۔۔۔۔۔

اور میانوالی جہاز چوک سے پولیس کی گاڑیوں نے ایک زناٹے دار آواز کے ساتھ پھر رفتار پکڑی اس کے بعد راوی خاموش ہے۔۔۔۔!

☆☆☆

جھونکا ہوا کا

اس نے الماری کھولی

اس میں اس کا پورا ماضی محفوظ تھا

لیکن یہ سوچ کر کہ وہ چند ماہ میں زمین سے رختِ سفر باندھ کر عدم کو جا گھر کرے گا۔ اس نے الماری کو بند کر دیا۔ اس الماری اور اس میں رکھی اشیاء کی اہمیت ہی کیا ہے۔ جب میں ہی نہیں رہوں گا تو کون ان چیزوں کو کام میں لائے گا۔ یہ تصویرِ بتاں اور چند حسینوں کے خطوط کس کام کے۔۔۔؟ میری کالج لائف کی ڈائیریوں میں ایک ہی خوشبو ہے۔۔۔ دنیا کی ہر خوشبو سے زیادہ بے خود کر دینے والی اور مشامِ جاں میں اترنے والی۔ ہر کتاب، کاپی، نوٹ بک، قلم، پنسل پر اس کی انگلیوں کا لمس موجود ہے۔ وہ میری ہر چیز کو چھو لیا کرتی تھی

یہ پنسل تمہاری ہے۔۔۔ وہ کھلکھلا کر پوچھتی

ہاں میری ہے

وہ پنسل پر نرمی سے اپنے ہونٹ رکھتی اور کہتی

اب مجھے اس پنسل سے نکال کر تو دکھاؤ۔۔۔ اب جب بھی کوئی سکیچ تم اس پنسل سے بناؤ گے مجھے اس سکیچ میں موجود پاؤ گے۔ اور پھر جب تم سکیچ مکمل کر کے اسے دیکھو گے تو تمہیں سکیچ نظر ہی نہیں آئے گا

کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟

تمہیں میں ہی میں نظر آؤں گی کیوں کہ میں پنسل میں جو موجود ہوں

ایک دن کالج کینٹین میں میرے لئے Disposable Cup میں چائے لے آئی۔ آسمان پر بادل تھے اور ہوا کی نرماہٹ تھکن اتارتی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اسے

سب رنگوں میں سے یہ رنگ زیادہ جچتا تھا۔اور وہ یہ پہنتی بھی کم کم تھی پلاسٹک کی میز پر اس نے چائے کے کپ رکھے۔میں نے چائے کا کپ پکڑا تو کہنے لگی دیکھ کر۔۔۔کپ میں کچھ ہے تو نہیں۔۔۔؟

مکھی گر گئی ہے کیا۔۔۔؟

سر پیچھے جھٹک کر وہ اتنی بے ساختہ ہنسی کہ سارے سٹوڈنٹس نے پلٹ کر ہمیں دیکھا چلو۔۔۔یہ بھی اچھی رہی۔۔۔اب زندگی میں یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ ایک بار تم نے مجھے مکھی بھی کہا تھا چائے میں کیا تھا۔۔۔؟

میں تھی جسے تم نے نکال باہر کیا ساری یادیں تروتازہ ہیں۔۔۔سدابہار' بے خزاں۔۔۔!

تم نے مشاعرے میں حصہ کیوں نہیں لیا۔۔۔؟

شاعری چھوڑ دی ہے میں

کوئی سانس لینا بھی چھوڑ سکتا ہے

ہاں کبھی کبھی ایسے ہوجاتا ہے

آج موسم اداس ہے یا تم نے سارے موسموں میں اداسی رکھ دی ہے۔۔۔؟

مجھے اسلم انصاری کا گوتم کا آخری وعظ یاد آرہا ہے

مرے عزیزو

مجھے محبت سے تکنے والو

مجھے عقیدت سے سننے والو

مرے شکستہ حروف سے اپنے من کی دنیا بسانے والو

مرے الم آفریں تکلم سے انبساطِ تمام کی لازوال شمعیں جلانے والو

بدن کو تحلیل کرنے والی ریاضتوں پر عبور پائے ہوئے' سکھوں کو تجے ہوئے بے مثال لوگو

حیات کی رمزِ آفریں کو سمجھنے والو' عزیز بچو میں بجھ رہا ہوں

میرے عزیزو میں جل چکا ہوں

مرے شعورِ حیات کا شعلۂ جہاں تاب بجھنے والا ہے

میرے کرموں کی آخری موج میری سانسوں میں گھل چکی ہے

ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی
ہم کینٹین کے برآمدے میں آ گئے
اس کے اندر منظر بدلا
اس نے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔۔۔بارش کا زور تھا
وہ اٹھ کر ایک بار پھر الماری تک گیا۔اس میں سے کالج کی یادوں کو نکال کے خوش ہونا چاہا۔لیکن اس کے اندر کوئی مر چکا تھا۔الماری میں رکھی یادوں کو مقفل ہی رہنے دیا جائے۔اس نے اپنے لیے ''کافی'' بنائی۔میز پر بکھرے کاغذوں کو ترتیب دیا۔
''کافی''میں سے اسے اس کی جھلک دکھائی دی
کوئی سر پیچھے جھٹک کر بے ساختہ ہنسا۔۔۔اور وہ اداس ہو گیا
صبح اٹھنے پر اس کا پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ناشتے کی میز پر وہ سوچتا رہا
رات بھر وہ مجھے کیوں یاد آتی رہی۔۔۔؟مجھے گوتم کا آخری وعظ بار بار کیوں یاد آتا ہے۔۔۔؟میری زندگی اور اس وعظ میں ایسی کون سی مماثلت ہے۔۔۔؟مجھے ہسپتال پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے۔۔۔رات ایمرجنسی سے کوئی فون نہیں آیا۔امید ہے میرا وہ مریض جسے ٹی بی ہوگئی ہے۔جلد بہتر ہو جائے گا۔
ایک میری بیماری کے سوا شاید ساری بیماریوں کے علاج موجود ہیں
وہ ہسپتال پہنچا
پہلے وارڈ کا راؤنڈ کیا۔مریضوں کو تسلی دی۔ان کی فائیلیں بہ غور دیکھیں۔کچھ کو مسکرا کر ڈسچارج کیا ' کچھ کی دوائیوں میں ردو بدل کیا
اور جب اپنے کمرے میں پہنچا تو میز پر پندرہ بیس مریضوں کے کارڈ رکھے تھے۔
چپراسی نے اندر اسے اطلاع کی۔۔۔سر۔۔۔آپ کا کوئی دوست ہے۔
آنے دو۔۔۔
وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔۔۔
چند لمحوں میں اپنے کمرے کے ملحقہ واش روم سے نکل کر تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ مسکرائے۔۔۔مجھ سے بغل گیر ہوئے۔۔۔چائے کا کہا

میرے دوست ۔۔۔۔اگلے سال انہی موسموں میں تمہارا ڈاکٹر عبداللہ تمہارے درمیان نہیں ہوگا

تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔!

میں ٹھیک کہہ رہا ہوں

یہ اچانک کی گفتگو بڑی حیران کر دینے والی تھی ۔اس کی بیماری کا تو علم تھا لیکن یہ ایک نیا انکشاف تھا۔

اس کے چہرے پر کہیں کوئی دکھ کا پرتو نہیں تھا۔۔۔۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔ایسا نہیں ہوگا۔

ایسا ہی ہوگا۔ میں خود ڈاکٹر ہوں مجھے معلوم ہے میرے اندر کیا ہو رہا ہے میں اپنی دھرتی کے قابل ترین ڈاکٹروں سے مل چکا ہوں۔سب کی ایک ہی رائے ہے۔

دو سال گزر گئے اب ایک سال باقی ہے

ایک درد میرے اندر اترنے لگا جیسے رات کی تاریکی ایک دم چھا جائے

رات کی چادر میں تارے ہی تارے تھے

رات کو معلوم ہی کہاں تھا کہ میرا دکھ کتنا بڑا ہے

میں رات ہوں اور میرے اندر کوئی تارہ نہیں روشنی کی کوئی ننھی منی سی کرن' امید کی قندیل یا کوئی ایسا روزن جس میں سے کوئی کرن چوری چھپے میرے اندر آجائے اور میری رات کو چرا لے جائے۔رات میرے اندر پھیلتے پھیلتے اتنی گہری ہوگئی ہے کہ پاتال تک میری آواز کی روشنی پہنچ ہی نہیں پا رہی لیکن میں نے روشنی تلاش تو کرنی ہے کیوں کہ مجھے ابھی ایک سال اور زندہ رہنا ہے۔

میں ڈاکٹر عبداللہ ہوں۔۔۔

میری موت اور زندگی کے بیچ تین سو پینسٹھ دنوں کی مسافت ہے۔ مجھے یہ مسافت طے کرنی ہے۔ مجھے اپنے ناتواں وجود پر ان دنوں کا بوجھ ابھی ڈھونا ہے۔ میں ہانپ بھی جاؤں سفر تو نہیں رکے گا۔۔نا

ایک روز سانس کی گاڑی وقت کے کسی نامعلوم اسٹیشن پر رک جائے گی۔ میں آخری ہچکی لے کر اگلے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا اور زمانہ اپنی رفتار سے چلتا رہے گا۔

میرا دل پھیل گیا ہے۔ انلارج ہو گیا ہے

میرا مرض لاعلاج ہے

میں چونکا اور ڈاکٹر عبداللہ کی آنکھوں میں جھانکا

یہ میرا وہم ہے یا۔۔۔؟

کیا دیکھ رہے ہو۔۔؟

تمہاری آنکھوں میں روشنی ہے یا راکھ۔۔۔۔!

ایک تو تم قلم کار دور کی کوڑی لاتے ہو

راکھ ہے نہ روشنی۔۔۔! تم اس فلسفے کو چھوڑو

یہ کہو۔۔۔آج تمہاری مصروفیات کیا ہیں۔۔۔۔؟

تمہاری خاطر دنیا کا ہر کام چھوڑا جاسکتا ہے

نہیں نہیں مجھے اتنی بڑی قربانی نہیں لینی تم سے۔۔۔ایک چھوٹا سا کام ہے

حکم میری سرکار۔۔۔!

یار۔۔۔آج میرے ساتھ قبرستان تک چلو گے۔۔۔؟

کس کی یادوں پر چراغ جلانا ہے

ہر بات کو مذاق میں نہ اڑایا کرو۔ مجھے اپنی قبر کے لیے جگہ کا چناؤ کرنا ہے۔

تم۔۔۔کیسی باتیں لے بیٹھے ہو۔ دل کے بڑھ جانے کا کہیں نہ کہیں تو علاج ہوگا۔

تم اس موضوع کو چھوڑو۔۔۔تمہاری تسلی سے میری عمر میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

شام ڈھلنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے اپنے ساتھ قبرستان لے گیا

اس کے چہرے پر اتنا اطمینان کیوں ہے۔ یہ اپنا کتبہ اپنے ہاتھوں نصب کرنے آیا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے اس کی زندگی کی سانسیں تھوڑی سی رہ گئی ہیں پھر بھی اس کے چہرے پر دکھ اور بے چینی کا کوئی پرتو نہیں۔۔۔یہ کس دنیا کا باسی ہے۔۔۔۔؟

سڑک کنارے موٹر سائیکل کھڑا کر کے وہ قبرستان میں داخل ہوا۔ السلام علیکم یا اہل القبور کہہ کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دعا کے بعد رشتہ داروں کی قبور پر الگ سے اس نے دعا کی۔

تم جانتے ہو میں یہاں تمہیں کیوں لایا ہوں۔۔۔؟

گہری چپ۔۔۔!

میں سڑک کنارے اس لیے دفن ہونا چاہتا ہوں کہ میرے دوست رشتہ دار جب اس راستے سے

گزریں تو مجھے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ ان کی یاد مجھے لحد میں بھی شادر کھے گی
اس نے شیشم کے ایک درخت کے نیچے اپنی لحد کا انتخاب کیا
یہ کیسا شخص ہے جو اپنی قبر کا چناؤ بھی خود کر رہا ہے
اب چلا جائے۔۔۔!

رات سرد تھی۔ اسے پھر نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کالج کے دنوں کی ڈائیری نکالی موسم بدلنے لگا اسی شام راوی کے کنارے میں نے اسے گوتم کا آخری وعظ سنایا تھا۔ کیسے گوتم کی طرح گیانی بنی آلتی پالتی مارے وہ نظم اپنے من میں اتارتی رہی تھی۔۔۔

میں اپنے ہونے کی آخری حد پر آ گیا ہوں
تو سن رہے ہو مرے عزیزو میں جا رہا ہوں
میں اپنے ہونے کا داغ آخر دھو چلا ہوں
کہ جتنا رونا تھا' رو چلا ہوں
مجھے اب نہ انت کی خبر ہے' نہ اب کسی چیز پہ نظر ہے
میں اب تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیستی کے سکوتِ کامل کے
جہلِ مطلق۔۔۔(کہ علمِ مطلق ہے)۔۔۔ جہلِ مطلق کے
بحرِ بے موج سے ملوں گا تو انت ہو گا
اس التباسِ حیات کا' جو تمام دکھ ہے!
میں دکھ اٹھا کر۔۔۔ مرے عزیزو۔۔۔ میں دکھ اٹھا کر
حیات کی رمزِ آخریں کو سمجھ گیا ہوں: تمام دکھ ہے
وجود دکھ ہے' وجود کی یہ نمود دکھ ہے
حیات دکھ ہے' ممات دکھ ہے
یہ ساری موہوم و بے نشاں کائنات دکھ ہے
شعور کیا ہے؟ اک التزامِ وجود ہے اور وجود کا التزام دکھ ہے
جدائی تو خیر آپ دکھ ہے' ملاپ دکھ ہے
کہ ملنے والے جدائی کی رت میں ملے ہیں' یہ رات دکھ ہے

یہ زندہ رہنے کا' باقی رہنے کا شوق' یہ اہتمام دکھ ہے
سکوت دکھ ہے' کہ اس کے کربِ عظیم کو کون سہہ سکا ہے
کلام دکھ ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام دکھ ہے
یہ ہونا' دکھ ہے' نہ ہونا دکھ ہے' ثبات دکھ ہے' دوام دکھ ہے'
مرے عزیزو' تمام دکھ ہے

اس نے اوراق کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ جو پنسل میں موجود تھی' نوٹ بک اور چائے کی پیالی میں موجود تھی۔ اس نظم کی سطر سطر میں سانس لے رہی تھی۔ اور ساتھ میں موت زینہ زینہ اتر رہی تھی اس کے پورے وجود کو گھائل کرتی موت' اس کی طرف بڑھ رہی تھی اس کے بدن کی پنسل پر موت نے اپنے ہونٹ رکھ دئے تھے اور پوری کی پوری اس کے اندر سماتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ اس کے وجود میں سما گئی تھی۔

اسے دونوں سے محبت تھی
اسے کسی کو ناراض کرنا آتا ہی نہیں تھا۔
وہ موت کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا
مومن کا کام تو نہیں کہ وہ تحفہ لوٹا دے۔۔۔

اس نے اپنے وجود کی طرح بوسیدہ اوراق دیکھے ان میں نشاط فاطمہ کا ناول ''آنسو جو بہہ نہ سکے بھی شامل تھا''۔۔۔ ناول کے پہلے صفحے پر اس نے کوئی شعر' جملہ یا اچھا تا خیال لکھنے کی بجائے اپنے ہونٹوں کا عکس ثبت کر دیا تھا۔

کبھی زندگی میں بہت زیادہ تھک جاؤ تو ان ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دینا میں تمہارے سارے دکھ اپنے اندر اتار لوں گی۔۔۔
سب کتابی باتیں ہیں۔۔۔
کبھی آزما کر دیکھ لینا

اس نے کتاب نکالی اور اپنے ہونٹ کتاب میں رکھ دئے
اس کے پورے وجود میں ایک ٹھنڈا میٹھا لمس اترنے لگا۔ وہ لمس جسے آج تک کہیں شاعری' افسانے' ناول نگاری' مجسمہ سازی' پینٹنگز' یا کسی اور فن میں بیان ہی نہیں کیا جا سکا۔ لمس جسے بیان

کرنے کو تمام فنون ادھورے اور کم پڑ جاتے ہیں۔۔۔

میں ہسپتال اور گھر میں اس سے اکثر ملاقات کو جانے لگا

اس کے چہرے پر لکھی تحریر پڑھنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا۔اس کے چہرے پر کوئی تحریر ہوتی تو میں پڑھتا وہاں تو مسکراہٹ کی تازہ کلی رکھی رہتی تھی۔برلبِ سڑک ملاقات کا سامان ہو تو مسکراہٹ بغلگیر ہونے کو بے قرار' یہ کیسا انسان ہے جس کی آخری گھڑی میں گنے چنے دن باقی ہیں اور یہ زندگی کی پگڈنڈی پر سرپٹ بھاگا چلا جا رہا ہے

موت کا ذکر ہی نہیں کرتا

موضوع ہی بدل لیتا ہے۔۔۔

ایک دن کہنے لگا

مجھے موت کا غم رتی بھر نہیں ہے۔۔۔لیکن ایک غم میرا اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے میری نظریں اس کے چہرے پر تھیں اور میں ہمہ تن گوش تھا

مجھے اپنی بوڑھی ماں اور ضعیف باپ کا دکھ کھائے جا رہا ہے۔وہ میری موت کا دکھ کیسے جھیل پائیں گے؟

مجھے تو گھر بھی نہیں بسانا چاہئے تھا۔۔۔میں نے سوچا تا تھا

جس لڑکی نے سات ماہ میں بیوہ ہونا ہو اسے کیوں بیاہ کر لایا جائے لیکن ماں کی ضد کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ماں میرے سر پر سہرا دیکھ لے۔۔۔!

ڈاکٹر عبداللہ اچانک چپ ہو گیا اور آسمان کو تکنے لگا۔۔۔

چپ کیوں ہو گئے۔۔۔۔؟

ہوں۔۔۔!وہ جیسے خواب سے چونکا

وقت کی رفتار کی پیمائش آج تک نہیں ہو سکی۔یہ پیمانے ہم نے خود ترتیب دے لیے ہیں۔اور انہی میں مقید سانسیں کھینچ کر کوچ کر جاتے ہیں

ڈاکٹر عبداللہ کی آواز میں اتھاہ اداسی اتر آئی

سارے درخت ایک دم خزاں رسیدہ ہو گئے۔درختوں کے تنے سوکھ گئے' پتے زرد ہو کر شاخوں سے ٹوٹے اور رزقِ خاک ہوئے۔اس کے اندر چلنے والی اداس ہوا میری سانسوں سے ٹکرائی

کیا سوچ رہے ہو۔۔۔؟
کچھ نہیں۔۔۔اس کے لہجے میں راکھ تھی
کچھ تو کہو۔۔۔؟
میں کسی کے نام دکھ لکھنا نہیں چاہتا تھا۔میں اپنی زندگی میں شامل ہونے والی لڑکی کی ماں سے ملا 'اس کے ابو سے وقت لیا اور اپنی زندگی کی کتاب ان کے سامنے رکھی اور آخری ورق پلٹ کر ان کو دکھایا
آخری ورق۔۔۔!
میں نے ان سے کہا۔۔۔
یہ ورق خالی ہے۔۔
پھر میں نے اس سے پچھلا ورق الٹا اور ان سے کہا
یہ حروف دھندلے دھندلے ہیں نا۔۔۔
بس ان دھندلے حروف اور آخری ورق کے بعد میں کہیں نہیں ہوں۔۔۔!
میں نے ان پر زور دیا تھا کہ اپنی بیٹی کو یہ کتاب اور اس کا آخری صفحہ دکھا دیں۔۔۔!
وہ چپ رہے اور انہوں نے کتاب ایک طرف رکھ کر کہا
تم ہمارے ہو۔۔۔!
کتاب اگر اس لڑکی نے دیکھ لی ہوتی' آخری ورق پڑھ لیا ہوتا جس پر کوئی تحریر نہیں تھی تو مجھے زندگی کے ایک اور عذاب کا سامنا نہ ہوتا۔۔۔بہت اہم رات ہوتی ہے۔کسی بھی شخص کی زندگی میں سہاگ رات اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت ایک ہی بار آتی ہے
موت اور پہلی سہاگ رات دوبارہ کبھی نصیب نہیں ہوتیں
میں نے جب کتاب کا آخری ورق اس کے سامنے رکھا۔۔۔وہ ہونقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگی
کیا تمہارے امی ابو نے تمہیں کچھ نہیں بتایا
اس کی آنکھوں میں اترتا خوف جب ہونٹوں کی جنبش تک پہنچا تب تک ہونٹ سوکھ چکے تھے
وہ تیسرے روز میکے گئی اور پلٹ کر نہ آئی۔
یار میں نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔میں نے تو اپنی ہر سانس اس کے سامنے رکھ دی تھی۔کوئی کسی کے

سامنے اپنی پوری کتاب بھی یوں کھول رکھتا ہے۔لیکن وہ مجھے چھوڑ گئی۔ یا روہ چند ماہ اداکاری ہی کر لیتی، میں سکون سے آخری سانسیں تو لے سکتا۔

اس کے جانے سے میری ماں کی آنکھیں بے نور ہوگئیں ۔۔۔باپ کی کمر خمیدہ ہوگئی

اب میرے پاس دن ہی کتنے رہ گئے۔۔۔؟

تعلیم مکمل کی' ڈاکٹر بنے' باپ نے مزدوری کر کے خود غربت کاٹی اور جب اس کے غم کٹنے کے دن آئے موت ہمیں کاٹنے چلی آئی۔کتنی بے بسی ہے۔۔۔۔!میں اس موت کو کچھ سال اور دھکا دے لیتا تو میرے والدین کو سانس لینا آسان ہو جاتا

وقت کے جام میں اس کی سانسوں کا مشروب قریب الختم تھا

ٹرینکولائزرز میں بھی نیند اللہ رکھتا ہے۔۔۔وہ جو نیند کا حکم ہی اٹھالے تو سب تدبیریں بے کار۔۔!

نیند پھر چلی گئی جیسے یونیورسٹی کے بعد وہ چلی گئی

شاید نیند آجائے لیکن وہ تو پلٹ کر نہیں آئے گی۔۔۔جانے کہاں ہوگی۔۔۔؟

کیا وہ تخیل تھا۔۔۔؟

میں نے اپنے اندر اسے خود تخلیق کیا اور اب اس کا انتظار کھینچ رہا ہوں

لیکن میں تو موت کا انتظار کھینچ رہا ہوں

اس نے ڈائری کھولی۔۔

بوسیدہ اوراق میں تر و تازہ یادیں رکھی تھیں۔ڈائری کے ساتھ ناول رکھا تھا۔۔۔

وہی ناول ''آنسو جو بہہ نہ سکے''

اس نے ناول کھول کر دیکھا

ہونٹ زندہ تھے

وہ مسکرایا اس کے اندر جھڑی لگ گئی۔ پورا کالج جل تھل ہوگیا

وہ لائبریری کے ایک کونے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے

اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔میرے ہاتھ میں جو پنسل تھی وہ اس نے لے لی

اس نے کہا تھا۔۔۔یہ تمہاری پنسل میں سنبھال کر رکھوں گی۔اور مجھ سے آخری دو ورق سننے کی ضد

کی

بابا۔۔۔شاعری تو سنی جا سکتی ہے۔۔۔تم ناول سنانے پر تلی بیٹھی ہو

پورا ناول تمہیں کون سنا رہا ہے۔۔۔آخری دو ورق ہی تو سنا رہی ہوں

اچھا سناؤ۔۔۔!

''ایک ٹک اس نے ہسپتال کی نئی عمارت کو دیکھا اور مسکرایا

''یہ میں ہوں''

فرانسس نے اس کی آنکھیں بند کرنی چاہیں

رہنے دو انہیں میں ابھی اسے، جو سامنے کھڑی ہے دیکھ سکتا ہوں۔اس نے تقریباً ہچکیوں میں کہا

فرانسس آنکھیں بند کرتا تھا اور وہ کھول لیتا تھا

پھر اس نے آخری بار آنکھیں کھولیں

فرانسس یہ دونوں خط میرے کفن میں رکھ دینا

موسم بہار کا جھونکا روتا ہوا گزر گیا۔گندھ راج کی خوشبو سوگوار تھی انہوں نے کہا'' وہ جاتا ہے جس کے ہم منتظر تھے مگر وہ آیا تو تھا۔۔۔شاید۔۔ایسا لگتا ہے جیسے وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا ہو''

دس سال بعد اس نے ہسپتال چھوڑ دیا وہ ختم ہو گیا جس نے ایک بار محبت کی تھی اس کے پہلو میں حافظ کے اشعار کھلے تھے۔۔۔

Death won the game , Hafiz can loose no more

اس نے کتاب کھول کر دیکھی۔۔۔، ہونٹ نہیں تھے یا شاید دھندلا گئے تھے

''اس نے اپنے آپ سے سوال کیا

کیا مجھے بھی کسی سے محبت تھی۔۔۔؟

ہاں۔۔۔

کون۔۔۔؟

اتنے میں دستک ہوئی اس نے دروازہ کھولا

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا۔۔۔۔

کس کی آوازِ پا۔۔؟

میں نے بے تکلفی سے پوچھا
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا
آج موسم پھر اداس ہے۔۔۔میں سمجھا وہ آئی ہے۔۔۔!چلو رہنے دو۔۔۔تمہیں یاد ہے تم نے ایک بار پوچھا تھا۔۔۔!
تمہاری آنکھوں میں روشنی ہے یارا کھ۔۔۔۔۔؟

ہاں۔۔۔یاد ہے
آؤ دوست میں تمہیں بتاؤں یہ اسی کی ادا تھی
ڈاکٹر عبداللہ نے کمبل اپنے اردگرد مضبوطی سے لپیٹا۔نقاہت نے اسے نحیف کر دیا تھا
اس نے کہا تھا۔۔۔تمہارے وجود کا کوئی ایک حصہ تو صرف میرا ہو‘ یہ کہہ کر وہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور کہا مجھے اتنی دیر اپنے اندر جذب کرو کہ زندگی میں اور کوئی ان آنکھوں سے اندر نہ جا سکے۔۔۔ہر ملاقات پر اس نے یہی کیا اور اب ان آنکھوں سے مجھے اور کوئی نظر نہیں آتا۔
وہ میری آنکھوں میں مکیں ہے
پہرہ دیتی رہتی ہے کہ کوئی اور میرے اندر نہ پہنچ جائے۔۔۔
ایک دن میں نے اسے کہا تھا اگر موت کی زردی ان آنکھوں میں اتر آئی تو کیا اس کو بھی روک لوگی۔۔؟
اس روز وہ بہت روئی تھی
آج بھی اس کے آنسوؤں کے قافلے کی گھنٹیاں مجھے اپنی آنکھوں میں سنائی دیتی ہیں
میرے دوست۔۔۔موت نے تو سکندر اعظم کو خالی ہاتھ کر دیا تھا۔موت تو سقراط کے پیالے میں بھی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔موت تو سرمد کے لہو کی ہر بوند میں رقص کناں تھی۔اب پھر
اس کائنات میں اس نے میرا چناؤ کیا ہے۔میں اسے پسند آ گیا ہوں۔میں نے ایک دن موت سے کہا
ابھی میری عمر اکتیس سال ہے
اس نے کہا پیمانے میرے نہیں۔۔۔کوئی اور ہے
اور موت نے یہ بھی کہا۔۔ڈاکٹر عبداللہ تمہیں نابود تو نہیں ہونا۔صرف آنکھوں سے اوجھل ہو جانا ہے

سرد ہوا کا جھونکا آیا تو اس نے اندر چلنے کو کہا

اس روز وہ بہت روئی تھی

اور تمہاری آنکھوں میں یہ راکھ۔۔۔؟

وقت اور حالات کی راکھ دبی ہے۔ اپنوں کی سرد مہریاں ہیں رویوں کے کانٹے ہیں۔

تین دن رہ گئے تھے۔۔۔ دھندلے ورق اس کے سامنے تھے۔ اس کا کہنا تھا وقت کی رفتار کی پیمائش آج تک نہیں ہو سکی۔ یہ پیمانے ہم نے خود ترتیب دے لیے ہیں۔ اور انہی میں مقید سانسیں کھینچ کر کوچ کر جاتے ہیں

اس نے میرے ساتھ آخری پیالی چائے کی پی

وہ مسکرایا۔۔۔ ہنسا اور کہا۔۔ تین دن بعد ہم نہیں ہوں گے

وہی تیقن، وہی ادا۔۔۔!

میری آنکھ میں آنسو اترنے سے پہلے اس نے کہا

Death won the game , Hafiz can loose no more

کئی سال سے ایک خبر گردش کر رہی ہے

میں اس خبر کی تصدیق اپنے افسانے کے قاری پر چھوڑتا ہوں

ڈاکٹر عبداللہ کی موت کے تین بعد ایک صبح اس کے خاندان کے کچھ افراد اور دوست اس کی مزار پر گئے

وہاں کوئی ایک کتبہ لگا گیا تھا جس پر تحریر رقم تھی

''تمام دکھ ہے''

اور کتبے پر ایک پنسل رکھی ہوئی تھی۔۔۔۔!

☆☆☆

0305 6406067
PDF Book Company

رونے کی آواز

روٹی کا نوالہ توڑ کر رفیق شاہ ابھی منہ میں ڈالنے کو ہی تھا کہ بلی کی آواز سن کر اس کا ہاتھ رک گیا۔ اوہ ہمہ تن گوش تھا۔ یہ بلی کے رونے کی آواز تھی۔ یہ وہی آواز تھی جب اس کے چک کی شمالی سمت ایک روز مسجد سے لوٹتے ہوئے اس نے یہ آواز سنی تو اسی روز اس کے بھائی کی موت کی خبر آ گئی۔ یہ آواز اس کے لاشعور کا حصہ تھی۔ اسی آواز نے روٹی کا لقمہ ہاتھ سے منہ تک موقوف کر دیا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب اس کی بیوی اندر داخل ہوئی

خیر تو ہے۔۔۔؟ شرف دین کے ابا

وہ اپنے سرتاج کو ہمیشہ پہلے بیٹے شریف الدین کے نام سے پکارتی تھی۔ جانے شین پر زبر اس نے کب ڈالی تھی۔ رفیق شاہ کو اس کے منہ سے شَرف دین کہنا بہت بھاتا تھا۔ تھوڑی دیر کو وہ سارے مسائل بھول جاتا۔ لیکن آہستہ آہستہ مسائل کا پلڑا بھاری ہوتا گیا۔ اور شین کی مٹھاس کم ہوتی گئی۔

میں پوچھ رہی ہوں خیر تو ہے' شرف دین کے ابا

کھانے سے ہاتھ کیوں اٹھالیا۔۔۔؟

چھت پر بلی رو رہی ہے۔

ہزار بار کہا ہے وہم نہ کیا کریں

کیسے نہ کیا کروں۔ یہ کوئی معمولی بات ہے۔ بلیاں یونہی نہیں رویا کرتیں۔ ان کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ آنے والے خطرے کی بو سونگھ لیتی ہیں۔ دیکھ لینا۔ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ سنو تو۔ کتنی بھیانک آواز ہے۔

روٹی کا ذائقہ کیوں کڑوا ہو گیا ہے۔۔۔؟

روٹی کا ذائقہ ٹھیک ہے۔ آپ کے منہ کا ذائقہ بدل گیا ہے۔

برتن اٹھالو۔اب مجھ سے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔
تھوڑا سا تو کھالیں۔۔۔
رفیق شاہ کے ہاتھوں میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا۔جب خوف اس گرد گھیرا ڈالتا۔ تو اس کے ہاتھ کانپنے لگ جاتے۔آنکھیں خوف سے ابلنے کو آتیں۔اس کا پورا وجود لرزتا۔اس کے اندر کی آواز اس کے وجود کو بھی ہلا دیتی۔یہ خوف کہاں سے آتا ہے۔۔۔؟ یہ نظر کیوں نہیں آتا۔کبھی نظر آجائے تو میں اس کو کچا چبا جاؤں۔اس سے پہلے کہ یہ میری بوٹیاں نوچ کر کھا جائے۔میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔یہ میرے بچوں کا دشمن ہے۔ڈاکٹر غلط کہتا ہے۔مجھے ڈیپریشن نہیں ہے۔ایسے ہی مجھے گولیاں دے دے سالوں سے سلا رکھا ہے۔یہ تو امیروں کی بیماری ہے۔ان کے مسائل ہوتے ہیں۔ان کو اپنی دولت اور کاروبار کی عمارت کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔میرا کیا ہے۔۔۔؟ ایک ادارے میں ملازم ہوں۔معقول تنخواہ ہے گزارہ ہو رہا ہے۔کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔لیکن یہ مجھے بلی کی آواز سے کیوں خوف آتا ہے۔۔۔؟ اسی آواز کو میرے ہمسائے نے بھی تو سنا ہوگا۔کیا میں اپنے بچے کو بھیجوں کہ وہ جا کر راؤ صلاح الدین کو دیکھ آئے۔کیا وہ بھی ڈر گیا ہے۔نہیں نہیں اس میں تو ہتک ہے۔وہ کیا سوچے گا۔۔۔؟ میں اتنا بزدل ہوں۔میں بزدل ہرگز نہیں۔سارا دن مزدوری کرتا ہوں۔میں بزدل کیسے ہو سکتا ہوں۔میری بیوی شاید میری تسلی کو کہتی ہے۔کہ ڈرا نہ کرو۔وہ خود بھی ڈرتی ہے۔اگر اسے ڈر نہ ہوتا تو میرے سفر پر جانے کے دوران ہمسائی کو کیوں گھر لا سلاتی۔کیا ہر شخص اندر سے ڈرا اور سہا ہوا ہے۔یہ ڈاکٹر نے جو گولیاں دی ہیں ان سے سکون تو آجاتا ہے۔لیکن دن بھر طبیعت سے کسلمندی نہیں نکلتی۔ایسے محسوس ہوتا ہے بس اس وجود کو گھسیٹے پھر رہا ہوں۔خوشی کہیں اندر ہی مر گئی ہے۔اس دن میری بیٹی سسرال سے آئی تو نواسے کو گود میں لے کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔جانے میری بیٹی اس وقت میرے چہرے پر کیا تلاش کر رہی تھی۔۔۔؟ اسے میں کیا بتاتا کہ ہر شخص کے اپنے حصے کے بھی کچھ غم ہوتے ہیں۔چاہے وہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔وہ ہر وقت کیسے ہنس سکتا ہے۔اس کے اندر بھی اک عمر کا گورستان ہوتا ہے۔

اب یونہی بیٹھے بیٹھے رات گزار دیں گے۔۔۔۔؟ لیٹ جائیں اور لحاف اوڑھ لیں۔میں چائے کی پیالی بنا لاتی ہوں۔گولی لے لیں۔نیند بھی آجائے گی اور سکون بھی۔

اب تو ان نیند کی گولیوں سے بھی مجھے خوف آنے لگا ہے۔ رات کے وقت آنکھ کھل جائے۔ تو بدن ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ باقی ماندہ رات جاگ کر گزارنے کا خوف مار کھاتا ہے۔ اس لمحے کسی کو جگایا بھی نہیں جا سکتا۔ رات میں کون کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ رات تو ہمیشہ اکیلے ہی کاٹنا ہوتی ہے۔ بہت سال ہو گئے اس عذاب سے جانے عمر کے کسی پیمانے میں جان چھوٹے گی یا نہیں۔

اب تو گولی لے لیں۔۔۔ کل صبح امام صاحب سے پانی دم کرالائیں۔ اور گھبرایا نہ کریں

اچھا۔۔۔ اس نے صرف اتنا کہا

ڈیپریشن کی ادویہ نے اس کی قوتِ فیصلہ بھی چھین لی تھی۔

اسے یہ خوف بھی دامن گیر رہنے لگا تھا کہ اگر ان ادویہ نے میرے اعصاب کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا تو ایک روز میں مر جاؤں گا۔ اور اگر میں مر گیا تو میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ حالاں کہ خود اس کے والدین اسے بچپن میں داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ ہنسی خوشی زندگی جینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کوئی مر گیا تھا اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جس روز مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ میرے اندر کون مر گیا ہے اس روز شاید میں جی اٹھوں۔

وہ اپنے اندر کی جنگ پوری توانائی سے لڑ رہا تھا۔

شاید۔۔۔ یہ خوف اس دن شروع ہوا تھا جس روز اس کے دادا نے کہا تھا۔ کہ گورداس پور ایک روز ان کے چھپر پر بلی روئی تھی اور ہندوستان دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ یہ بلی ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ یہ یقیناً اس وقت بھی روئی ہوگی جب پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔۔۔! پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے سے وہ اندر سے پورے کا پورا لرز گیا۔ اسے لگا وہ ایک بار پھر اجڑ گیا ہے۔ ہر طرف آگ اور خون ہے۔ پٹ سن کے ریشے ہیں۔ اردو اور بنگلہ زبان کی دھجیاں ہیں۔۔۔۔ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔۔۔؟ یہ میرا مسئلہ تو نہیں ہے۔ یہ تو حکمرانوں کا مسئلہ ہے۔ میرا مسئلہ تو صرف خوف ہے۔۔۔ مہنگائی ہے۔ قتل و غارت گری ہے' بسوں' بازاروں اور عمارتوں میں ہونے والے بم دھماکے ہیں۔ مجھے تو اپنے حصے کا رزق کمانا ہے۔ اور زندگی کھینچنی ہے۔

میں اتنے دور کی کیوں سوچ رہا ہوں۔ کیا مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ میں کسی ارضی اور سماوی آفت کو روک سکوں

بلی کا کیا ہے۔۔۔؟

لیکن اسے نظر انداز بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح گورداس پور میں اس کے رونے سے۔۔۔۔!
وہ اس سے آگے کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا۔
اگر یہ صرف وہم ہے تو اس کا علاج بھی تو ہونا چاہئے۔ اب تو سائینس نے اتنی ترقی کر لی ہے۔۔۔!
اس کے پاس اپنے ہی سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔
وہ ایک منتشر الخیال شخص تھا۔
اور اب جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی اس کے اندر مر گیا ہے تو یہ اس کی بیماری کی دوسری سیڑھی تھی۔ اگلے روز وہ ڈیوٹی پر نہیں گیا۔ اس نے امام مسجد سے تفصیلی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک تو جب سے اسے اس بیماری نے گھیرا تھا سب اس کی لایعنی گفتگو سے کنی کترانے لگے تھے۔ اسے یہ بھی وہم یقین کی حد تک تھا کہ اس کی بات کو کائی بھی اہمیت نہیں دیتا۔
وہ جب بوڑھے پیپل کے درخت کے پاس پہنچا تو حسب معمول نائی اپنی دکان لگا چکا تھا۔ اس نے اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا اور نائی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی اور آئینہ لگانے کے بعد نائی گرد بٹھانے کے لئے چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ چھڑکاؤ کرنے کے بعد اس نے اپنے اوزار سجائے۔ اسی دوران پیپل کے نیچے ایک نیم پختہ کمرے سے اعلان ہوا۔۔۔
حضرات۔۔۔ دیسی انڈا پانچ روپے کا۔۔۔ جن جن کے گھر میں انڈے رکھے ہیں وہ جلدی جلدی لے کر آئیں ایک صاحب کو دو درجن انڈوں کی ضرورت ہے۔
یہ گاؤں کا معمول تھا۔ تھوڑی دیر میں بچے بچیاں اور بڑے بوڑھے انڈے لانے لگے۔
شیو کے دوران اس نے دوسرا اعلان سنا۔۔۔
مجید مہاجر کا لاہور سے فون آ رہا ہے۔ وہ دس منٹ میں فون سننے کے لئے پہنچ جائے۔ پیپل کے نیچے ایک پورا شہر آباد تھا۔ ایک پی سی او' منیاری کا کھوکھا' نائی کی دکان' موچی' ایک لوہار اور ترکھان بھی اپنا رندہ سارا دن پھیرتا رہتا تھا۔ یہ لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں سے یہاں آ کر بس گئے تھے اور چھپن سال گزرنے پر بھی سرحد پار ان کے جو گاؤں ان سے جدا ہو گئے تھے ان کے لئے ان کے اندر سے ٹھنڈی آہ نکلتی تھی۔ ان کو معلوم تھا یاد کا تعلق عمر کے ساتھ ہوتا ہے اسے برسوں کے محدود پیمانے میں نہیں ماپا جا سکتا۔

پیپل سے چند قدم کے فاصلے پر مسجد تھی۔ مسجد کا نقشہ بالکل اسی طرز پر تھا جو اس کے آباء واجداد ھندوستان میں چھوڑ آئے تھے۔ ان کے اندر ابھی ان کے پورے مکمل گھر ساز وسامان سمیت زندہ تھے۔ تقسیم نے ان کے اندر تعمیر شدہ عمارات میں کوئی دراڑ نہیں ڈالی تھی۔۔۔

ابھی وہ شیو کرا رہا تھا۔۔۔ کہ ایک بلی پیپل کے نیچے سے گزری

میں تم سے نہیں ڈروں گا۔۔۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا

وہاں سے وہ مسجد میں پہنچا۔ امام مسجد بچوں کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ وہ باادب وہاں بیٹھ گیا۔

رفیق شاہ کیسے آنا ہوا۔۔۔۔ امام صاحب نے ملائمت سے پوچھا

مجھے ہر وقت خوف گھیرے رہتا ہے جی۔۔۔! آپ پانی دم کر دیں

میرے بھائی ۔۔۔ ہر وقت اللہ کا ذکر کیا کرو۔ تم نے دیکھا ہو گا۔ کہ بلائیں اور چڑیلیں ہمیشہ کھنڈروں میں بسیرا کرتی ہیں۔ وہ جگہ جہاں کسی کا مسکن نہیں ہوتا۔ ویران ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دل کھنڈر ہو جائیں تو خوف ان میں ڈیرہ ڈال لیتا ہے۔ امام صاحب اس کو تسلی دے رہے تھے۔ اور یہ جو تمہیں وہم ہے نا کہ کوئی تمہارے اندر مر گیا ہے۔۔۔ کوئی نہیں مرا تم خود مر گئے ہو۔۔۔!

ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے ڈیسک پر چھڑی زور سے مارتے تو طلباء کی آواز بلند ہو جاتی

اسی دوران وہی بلی جو شیو کراتے ہوئے اس کے سامنے سے گزری تھی۔ مسجد کے سامنے والے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کی آواز میں عجیب طرح کا اجاڑ پن تھا۔ رفیق شاہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ کیوں کہ وہ امام صاحب کے پاس اپنے آپ کو محفوظ تصور کر رہا تھا۔

خوف نے اس لمحے اس کو اچانک اپنی گرفت میں لے لیا جب اس کی نظر امام صاحب کے چہرے پر پڑی

امام صاحب کے ہاتھ میں جو تسبیح تھی اس کے دانے سرعت سے گر رہے تھے

اس نے امام صاحب سے پوچھا

امام صاحب بلی کیوں روئی ہے۔۔۔؟

امام صاحب خاموش تھے۔ اس کی نظریں امام صاحب کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ اس نے دیکھا امام صاحب کے چہرے پر پسینہ اتر آیا ہے۔۔۔۔!

کھلن کو مانگے چاند

اس نے ایسی ہی تاروں بھری رات میں مجھے اپنانے کا وعدہ کیا تھا اور آدھی چوڑی کی طرح آسمان کے کنارے چاند کو دیکھ کر مجھ سے پچیس برس بعد کہانی لکھنے کا وعدہ لیا تھا۔ تمھیں یقین ہے میں پچیس برس زندہ رہوں گا؟

ہاں، یقین ہے!

کیسے۔۔۔۔۔۔؟

جیسے مجھے اپنے ہونے کا یقین ہے۔

آج رات آسمان پر تارے بے شمار ہیں۔ چاند بھی آدھی چوڑی میری ہتھیلی پر رکھ گیا ہے۔ چوڑی میں یادیں اور باتیں ہیں۔ چاند کو کیا معلوم یادوں کا دُکھ کیا ہوتا ہے؟ اسے نہیں معلوم اداسیاں سفر میں ہوں تو منزلیں گم ہو جاتی ہیں۔ وہ تو بس چمکتا ہے، چاندنی بکھیرتا ہے۔ مجھے اس چاندنی میں آدھی چوڑی کی کہانی لکھنی ہے۔ ہاتھوں کی لکیروں کو کھولنا ہے، ادھیڑنا ہے، ادھڑی لکیروں میں لمحوں کو تلاش کرنا ہے، وہ لمحے جو اَن کہے وعدوں کی دہلیز پر آج بھی سسک رہے ہیں۔ لمحوں کو موت نہیں آتی۔ جس دن لمحوں کو موت آگئی پوری کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پوری کائنات ''کن فیکون'' کی زنجیر میں بندھی ہے۔ کوئی ایک بھی لمحہ گم ہوا تو زنجیر بے کار ہو جائے گی۔ مجھے بھی ایک ایسے ہی لمحے کی کتھا سنانی ہے۔ میں کہانی کا عنوان بدل دیتا لیکن اس نے وعدہ لیا تھا کہ تم کہانی آدھی چوڑی کے عنوان سے ہی لکھو گے۔ مجھ سے بجز وعدوں کے وہ اور لے ہی کیا گئی؟

جس روز وہ آئی کوئی نئی بات نہیں تھی، نہ گھر میں نہ دل میں۔ دن بھی وہی رہا، رات

اور شام بھی۔ مجھے اس عمر میں پیام پڑھنے کہاں آتے تھے۔ آدھی رات کا سمے ہوگا، گاؤں میں سناٹا تھا۔ دُور کہیں اکا دکا کتے کے بھونکنے کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ رات چُپ اور آسمان پر تارے بول رہے تھے۔ تاروں کی کہانی سنتے سنتے میں سو گیا۔ اچانک مجھے پاؤں پر ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ کٹورے سے میرے پاؤں پر پانی ڈال کر وہ رُکی نہیں، اپنی چار پائی پہ جا کے لیٹ گئی۔۔۔۔۔۔۔ پوری رات ٹھنڈی ہوگئی۔ پاؤں کی ٹھنڈک پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ ہر چیز میں ٹھنڈ تھی۔ آسمان، تاروں اور چار پائی میں۔ آسمان پر تارے بے شمار تھے اور میرے دل میں ان کہی باتوں کی لذت بے کنار تھی۔ پانی کے لمس نے مجھے بہت دیر جگائے رکھا۔

صبح ہونے پر سورج کی کرنیں سرد تھیں۔ میں نے اسے دیکھا تو پاؤں پر پانی کے قطرے اترنے لگے۔ وہ چپ تھی لیکن پانی ڈالنے والے ہاتھ بول رہے تھے۔ ایک ہی رات میں اس نے پانی پر کہانی لکھ کر مجھے تھما دی۔

دوپہر میں وہ تکیے پر بازو کے سہارے لیٹی تھی۔ اگلی صبح اسے واپس جانا تھا۔ اَن کہی باتیں میرے ہونٹوں پر چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی تھیں۔ میرے پاس پانی کی زبان نہیں تھی۔ میرے ہونٹ خشک تھے۔ میں اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ جھجکتے جھجکتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میری ہتھیلی پر اس کا ہاتھ اُلٹا دھرا تھا۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ ہاتھ کی پُشت پر میرے نام کا پہلا حرف مہندی سے لکھا تھا۔ گلابی ہاتھ مہندی، گلاب کے پھول کھل اٹھے۔ گلابی ناخنوں پر مردہ اضافی ناخن اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

ناخن کاٹ لوں آپ کے۔۔۔۔۔؟

پوچھا کیوں ہے؟

ایک ایک کر کے میں نے اس کے ناخن اتار لیے۔۔۔۔۔

اس نے اپنے تُرشے ہوئے ناخنوں کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

چُپ کیوں ہو۔۔۔۔۔؟

کچھ نہیں۔

پھر بھی۔۔۔۔۔

ناخن اُتر گئے ، کسی روز تمہارے ہاتھ کی پشت سے مہندی اُتر جائے گی۔ دھیرے دھیرے پھر میری یادیں۔۔۔۔۔؟

وہ مسکرائی۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔ناخن،مہندی اور یادیں زندہ رہیں گی۔

ایک بات کہوں۔۔۔۔۔؟

کہیے۔۔۔۔۔؟

تراشیدہ ناخن اچھے لگ رہے ہیں۔۔۔۔۔

جی اچھا۔

بھول تو نہیں جاؤ گی۔۔۔۔۔؟

''کوئی نئی بات کرو، بوسیدہ باتیں، ہونہہ۔۔۔۔۔وعدے گرہ میں مت باندھو، نبھا نہ پائے تو جینا عذاب ہو جائے گا۔''

ہم دو دن کی ملاقات کے سہارے زندگی گزار لیں گے؟

دو دن۔۔۔۔۔؟ تم دو دن کی بات کر رہے ہو، زندگی تو ایک لمحے کے سہارے بھی گزاری جا سکتی ہے۔ وہ لمحہ جب اپنا ہو جائے تو اڑتالیس گھنٹے ہیں۔ میں نے تمہیں دیکھا ہے، سوچا ہے، جذب کیا ہے، محبت کو وقت کے پیمانوں میں کیوں تولنے لگے ہو، یہ ہے۔۔۔۔۔! بس اتنا کافی ہے۔

تکیہ اٹھا کر اس نے ایک طرف رکھا۔ کلائی سے چوڑی نکال کر دو ٹکڑے کی اور کہنے لگی۔ یہ آدھی چوڑی ہے۔۔۔۔۔میں اسے دوپٹے کے پلو میں لپیٹ کر دل نکالوں گی۔

یہ تو سہیلیوں کا کھیل ہے۔

جانتی ہوں، لیکن میں تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔ چوڑی ٹوٹے گی تو ایک کرچی الگ ہو جائے گی۔ وہ تمہارا دل ہوگا۔ دیکھوں، دل ہے بھی کہ نہیں۔۔۔۔۔؟ دوپٹے کے پلو میں کرچی نہیں تھی۔ وہ اداس ہو گئی، ملول اور غم زدہ۔۔۔۔۔اسی لمحے اس نے مجھ سے کہانی لکھنے کا وعدہ لیا۔

لیکن تم نے یہ عنوان کیوں چُنا، آدھی چوڑی۔۔۔۔۔؟

رہنے دو، جب تم میرے نہیں نکلے تو دل کا حال سنائیں کیا۔۔۔۔۔؟ پھر بھی۔۔۔۔۔؟

بچپن میں سہیلیوں کے ساتھ دوپٹے کے پلو میں چوڑیاں لپیٹ کر دل نکالا کرتی تھی۔ ایک

رات آسمان پر آدھی چوڑی جیسا چاند دیکھا تو دل مچل گیا۔ حُسنِ اتفاق سے ریڈیو پر گانا دھیمے سُروں میں چل رہا تھا۔

''انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاندرے''

جی چاہا دوپٹے کے پلو میں چاند لپیٹ کر توڑ دوں۔ شاید میرے نام کی کرن نکل آئے۔ بچپن گزر گیا، ارادہ باندھ رکھا تھا، کبھی کوئی من کو بھا گیا تو چاند دوپٹے میں ضرور لپیٹوں گی۔ تم ملے، چوڑی نہیں لپیٹی تھی میں نے، وہ چاند تھا میرے نام کی کوئی کرن نہ نکلی۔ جانے دو یہ قصہ، میں ہار گئی۔

پھر کبھی چاند پلو میں لپیٹو گی۔۔۔۔۔؟

اونہہ۔۔۔۔۔!

کبھی بھولے سے لپیٹ بھی لو تو مجھے ضرور لکھنا۔ میں تمہاری کرن سے ملنے آؤں گا۔

چاند نکلے گا نہ دل۔۔۔۔۔ کوئی اور بات چھیڑو۔

کسی موڑ پر اچانک مل گئے تو ایک دوجے کو پہچان پائیں گے۔۔۔۔۔؟

ہوں۔۔۔۔۔!

کیسے۔۔۔۔۔؟

بس۔۔۔۔۔ یقین کرلو۔

یقین میری ہتھیلی پر رکھ کے وہ چلی گئی۔ ہمارے خاندانوں میں ایک عرصے سے نفرت کی دیوار چُنی جا رہی تھی۔ اگلی صبح وہ مکمل ہوگئی۔ مسئلے کانٹوں کی طرح پوری دیوار پر پھیل گئے۔ وہ گاؤں سے لوٹ گئی۔

پچیس برس گزر گئے۔ میں شہر کے بھرے بازار میں سائن بورڈ پڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی بیوی کے لئے میچنگ سوٹ لینا تھا۔ جس دکان میں داخل ہوا، چند عورتیں سیاہ برقعوں میں لپٹی خریداری کر رہی تھیں۔ دکاندار ان کے سامنے کامدار کپڑے پھیلا رہا تھا۔

جی آپ اس طرف آجائیں۔۔۔۔۔ دکاندار نے مسکرا کر کہا۔

میری داہنی جانب جو عورت کپڑے دیکھ رہی تھی اس کی پشت میری جانب اور کامدار سیاہ سوٹ پر ہاتھ دھرا تھا۔ تراشیدہ ناخن اور مہندی سے لکھا میرے نام کا پہلا حرف۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''امی'' معصوم سے بچے نے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ''یقین'' میری مٹھی سے پگھل کر آنکھوں سے بہہ نکلا۔۔۔۔ باہر نکلا تو سامنے کے ہوٹل سے نکلتی آواز نے مجھے اپنے پلو میں لپیٹ کر توڑ دیا۔

''انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند رے۔''

کیڑا

شمو نے پہلو بدلا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا رات کا کون سا پہر ہے۔ وہ بان کی ننگی چارپائی پر ہی سو گئی تھی۔ صبح اٹھی تو اس کے بدن میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ دوپہر میں کھیتوں سے لوٹتے ہوئے اس نے آبادی کی ہٹی سے اسپرو کی دو گولیاں خریدیں۔ اسے بخار سے بہت ڈر لگتا تھا۔ خواہ مخواہ سارا پنڈا جلتا تھا۔ اس نے سوچا شام کو روٹی کھا کے گولیاں لے لوں گی۔ شام کے وقت بھی اتنا بہت سا کام تھا کہ اسے گولیاں لینی یاد نہ رہیں۔ اس نے تنور پر گھر بھر کی روٹی لگائی۔ ننھے کومل کے نہلایا۔ بابا کا حقہ تازہ کرنے کے لئے باہر کھیتوں سے خشک گوبر چن کر لائی۔ سب کو کھانا کھلا کر کتنی دیر ماں کا سر دباتی رہی۔ رات جب سونے لگی تو اس نے ماں سے کہا۔

"ماں میرے پنڈے میں پیڑ ہے۔۔۔"

اسپرو لے لے۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ بھائی کو دودھ پلا دینا۔ بوتل اندر طاقچے میں رکھی ہے۔

لیکن ماں تُو تو اسے اپنا دودھ پلاتی ہے۔

بس بہت پی چکا۔۔۔ اب بوتل میں دودھ پیا کرے گا۔

لیکن ماں، کیوں۔۔۔؟

اری چڑیل۔۔۔ ہر بات کو یوں نہ کریدا کر۔ مغز چاٹتی رہتی ہے ہر وقت۔ وہ چپ کر گئی۔ ماں بات بات پر بچوں کو گالیاں دینے کی عادی تھی۔ غربت کے ساتھ ساتھ شمو گالیاں سہنا

بھی سیکھ گئی تھی۔ وہ سوچتی تھی کیا دنیا کے ہر گھر میں ہماری طرح جھگڑے ہوتے ہوں گے؟ گالیاں چلتی ہوں گی یا پھر یہ ہمارا ہی مقدر ہے۔ اس نے بوتل میں دودھ ڈال کر جونہی پپل بھائی کے منہ میں دیا وہ کسمسا کر رونے لگا۔ اس کا باپ کھانس رہا تھا۔ شمو نے ننھے کو اٹھا کر ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔ لیکن اس کی ریں ریں بند نہ ہوئی۔ تب اس نے بھائی کو سینے سے لگا کر تھپتھپایا، پیار کیا تو بڑی دیر بعد مشکل سے اس نے بوتل سے دودھ پیا اور سو گیا۔ وہ خود اتنی تھکی ہوئی تھی کہ اندر سے تکیہ اور کھیس بھی نہ نکال سکی اور ننگی چارپائی پر سو گئی۔ پھر نہ جانے رات کا کون سا پہر ہوگا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ آسمان پر تارے ہی تارے تھے۔ مچھر اس کے خون کے پیاسے ہوئے جا رہے تھے۔ اگرچہ سرِ شام اس نے اپلوں کا دھواں چارپائیوں سے ذرا ہٹ کر جلا دیا تھا۔ شاید سلگتی آگ بجھ گئی تھی اور اب راکھ ہی رہ گئی تھی۔ اس کا پنڈا سلگ رہا تھا۔ شمو کو معلوم نہیں تھا، پنڈا کیوں سلگتا ہے؟ اس کے بدن میں درد کیوں کروٹیں لیتا ہے؟ اس نے سونے کی بہتیری کوشش کی لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی اور سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ تب اسے خیال آیا شام کو ہٹی سے اسپرو کی جو گولیاں خریدی تھیں وہ لینی یاد ہی نہ رہیں۔ اس نے چاہا اٹھ کر گولیاں لے لوں۔۔۔ پھر اسے خیال آیا۔

ایک دفعہ موئے ڈاکٹر نے کہا تھا، اسپرو کی گولیاں پانی میں حل کر کے لینی ہیں اور خالی پیٹ نہیں لینی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب گھر میں دسویں بچے کی آمد تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ڈسپنسری جایا کرتی تھی۔ ڈاکٹر بہت سے لوگوں کو اسپرو ہی دیا کرتا تھا۔ وہ سوچتی یہ تو گلی میں ہٹی والے پاس بھی ہیں، ڈسپنسری اور ہٹی میں کیا فرق ہوا؟ اس کا بابا کئی دفعہ کہتا، جا شیر والی گولی لے آ۔" چھوٹے بچوں کو بخار ہوتا تو وہی پیس کر دے دیتے"۔

شمو کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر دوپٹے کا سینو بنا کر اس نے سر کے نیچے رکھا۔ شاید نیند آ جائے، مگر نیند نہیں آئی۔ تب وہ اٹھی، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا ہے؟ بوجھل قدموں سے چلتی اندر سے وہ کھیس تکیہ اٹھا لائی۔ چارپائی پر کھیس ڈال کر وہ پانی پینے کے گھڑونجی کی طرف گئی تو گھڑا خالی تھا۔ شام کو اسے گھڑا بھرنا بھی یاد نہ رہا تھا۔ نل کو اس نے منہ لگایا۔ پانی پینے سے اسے سکون کا ہلکا احساس ہوا۔ اس نے منہ پر بھی چند چھینٹے مارے تو پارے کی طرح پانی کے قطرے اس کی گردن سے کھیلتے ہوئے گولائیوں سے نیچے اترنے لگے تو اس کا بدن گدگدانے لگا۔ وہ منہ پر بار بار پانی

کے چھینٹے ڈالنے لگی۔ نل سے پانی ٹپکنے کی آواز سے اس کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔

کون ہے؟

میں ہوں ماں۔

اری کیا کر رہی ہو، اس وقت؟

پانی پی رہی ہوں۔

کمبخت لگتا ہے آج پھر گھڑا نہیں بھرا۔ سب کو نل کا گرم پانی پلائے گی۔

ماں کے طعنے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کے اندر آگ سی بھڑک اٹھی۔ وہ بے اختیار ہو کر نل کے نیچے بیٹھ گئی۔ جانے وہ پھر کتنی دیر نہاتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سارے درد کسی نے چن لئے ہیں۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ اس کے کپڑے بدن کے ساتھ چمٹ گئے، پہلے اس نے کپڑے بدلنے کا سوچا، لیکن پھر وہ گیلے کپڑوں سمیت چمٹنے کا احساس لئے سو گئی۔

شمو کا باپ تڑکے تڑکے کھیتوں کو نکل جایا کرتا تھا۔ وہ بھینس کو چارہ ڈالتی، دودھ دوہتی، ناشتہ بناتی۔ اس کا باپ سورج کافی اوپر آ جانے پر لوٹ کر ناشتہ کرتا، لسی پیتا، حقہ گڑگڑاتا، اگر کھیتوں کا کام ہوتا تو لوٹ جاتا، نہیں تو گاؤں کی مشرقی سمت برگد کے گھنے درخت تلے ہمجولیوں کے ساتھ مل بیٹھتا۔ برگد کے نیچے فیروزے کا ہوٹل تھا۔ ہوٹل کیا تھا، گھاس پھونس کا ایک چھپر تھا۔ پکی اینٹوں کے دو چولہے، ایک چولہا مٹی کے تیل کا، دو کیتلیاں، سات مگے۔ میزوں کرسیوں کی بجائے اس نے سیمنٹ کے بنچ بنوالئے۔ رش نہ ہوتا تو چند بے فکرے وہاں آ کر لیٹ جاتے۔ چھپر کے ایک ایک کونے میں لوئے کے ایک بوسیدہ زنگ آلود ٹرنک میں ان بے فکروں کے لئے سگریٹ، بیڑیاں، ماچسیں اور چرس کی گولیاں رکھی ہوتیں۔ جن دنوں اس کا ہوٹل چرسی ہوٹل کے نام سے شہرت پانے لگا اس نے فوراً دھندا بند کر دیا۔ اور چیخ چیخ کر اپنی صفائی کی گواہی دی۔ سو قدم آگے جا کر وہ مسجد میں با جماعت نماز ادا کرنے لگا۔ اس نے مولوی صاحب سے کہ کر وہاں مؤذن کی جگہ سنبھال لی۔ برگد کے پہلو میں آخری ہچکیاں لیتا ہوٹل مرنے سے بچ گیا۔

اس روز شمو کا چھوٹا بھائی کھیلتے ہوئے شیشم کے درخت سے گر گیا۔ اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کی ماں نے اسے بھگایا کہ بابا کو جا کر بلا لائے۔ وہ چھپر تلے پہنچی تو اس کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ گاؤں کے چند بوڑھے اور نوجوان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اکو بھی

وہیں تھا۔ حسبِ عادت دانتوں تلے اپنا چاندی کا تعویذ چباتا، تیل سے چپڑے بالوں پر ہاتھ پھیرتا وہ فیروزے کے بکس سے سگریٹ نکال رہا تھا۔ اس نے بابا کو جگا کر ساری بات بتائی۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اگو کی آنکھیں دھوئیں کے پار سے اسے تک رہی تھیں۔ اس کی نظر اچانک اپنے کندھے پر پڑی۔ کندھے سے قمیض پھٹی ہوئی تھی۔ کندھے کو سنبھالتے سنبھالتے وہ سینہ سنبھالنا بھول گئی۔

اگو کا گھورنا اسے اچھا نہیں لگا۔

ہڈیاں جوڑنے والے کی ہسپتال نہر کے پار گھنے درختوں کے درمیان تھی۔ ہڈی جوڑ کمرے میں عجیب وغریب اوزار دیوار پر آویزاں تھے۔ لکڑی کے پنجے، چوڑی تختیاں، باریک لکڑی سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے اوزار، کمرے میں ایک طرف بھاپ کا سسٹم تھا۔ پانی کہیں اندر گھر میں ہی ابلتا تھا۔ مطب میں صرف پائپ سے بھاپ نکلتی جس سے وہ جوڑ نرم کرتا اور جوڑتا۔ اس کے پاس دور دراز سے لوگ آتے۔ آغاز میں ایک کمرہ تھا۔ رفتہ رفتہ کمرہ در کمرہ پورا ہسپتال بن گیا۔ لوگ مہینوں پلستر میں جکڑے رہنے کی بجائے اس کے علاج کو ترجیح دیتے۔ کیونکہ ہر دوسرے دن پٹی بدلنے سے متاثرہ حصہ سن نہیں ہوتا تھا۔

بابا کے ساتھ شمو درختوں تلے بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ جب ان کی باری آئی، وہ بھائی کے ساتھ مطب کے اندر نہیں گئی۔ اندر سے بھائی کی چیخیں اسے بے چین کر رہی تھیں۔ اس نے دوپٹہ دانتوں تلے داب لیا۔ جیسے اس کا بازو جوڑا جا رہا ہو۔ اگو اس کا پیچھا کرتے ہوئے آنکلا تھا۔

کمینہ!۔۔۔ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ تیس مار خان۔۔۔ الو کا پٹھا، گالیاں شمو کے بدن میں ہی گھومتی رہ گئیں۔

وہ گھر پہنچے تو ماں نے گرم گرم دودھ میں گھی اور انڈا ڈال کر پلایا۔ ماں کا کہنا تھا اس سے درد کم ہوتا ہے اور ہڈی جلد جڑ جاتی ہے۔

شام ڈھلے گھروں سے تندوروں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا باپ حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ کچے چولہے میں بیٹی توے پر روٹی ڈال رہی تھی۔ اس کی ماں بابا کے پاس پائینتی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بال میلے اور کھچڑی تھے۔ چہرے پر چھائیوں کا جال بچھا تھا۔ جوانی تو شاید دوسرے تیسرے

بچے کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔ وہ دونوں بٹائی پر زمین میں ہل چلا کر زندگی گزار رہے تھے۔ شمو کی ماں کے ذہن میں ماضی رینگ رہا تھا۔۔۔ جب وہ پہلی بار یہاں آئے تھے۔ حویلی کے میاں جی نے انہیں اپنی اولاد کی طرح گھر میں ٹھہرایا تھا۔ پردیسی ہونے کی وجہ سے انہیں عزت دی۔ چند ایکڑ زمین کے ساتھ انہیں ایک بھینس بھی دے دی۔ شروع میں ان کی آرام سے گزرتی رہی۔ رفتہ رفتہ بچے زیادہ ہونے سے مسائل بڑھنے اور پھیلنے لگے۔ وہ سوچتے گاؤں کے مولوی کے گیارہ بچے ہیں۔ وہ کتنا خوش ہے۔ جانے کیسے خوش رہتے ہیں یہ لوگ؟ اور تو اور گاؤں کی مغربی سمت ایک کسان جس کی بیوی گوری چٹی اور چوڑی چکلی تھی، ان کے اٹھارہ بچے تھے۔ گیارہ بیٹے اور سات بیٹیاں۔ اور سنا تھا تین بچے تو پیدا ہونے کے کچھ دیر بعد ہی مر گئے تھے۔ وہ بھرپور اور صحت مند تھی۔ مکھن کی طرح چکنی اور سفید۔ اس کے گالوں سے خون لاٹیں مارتا تھا۔ کنویں سے تین گھڑے سر اور ڈھاک پر اٹھا کر لاتی تو کمر لچکاتی۔ جوان لڑکیاں بھی حیران رہ جاتیں۔

ایک مشورہ کرنا ہے تم سے۔۔۔ اس نے ماتھے پر دوپٹہ کستے ہوئے کہا۔

کیا۔۔۔؟ شمو کے بابا نے حقے کی نے منہ سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔ مسائل بڑھتے جا رہے ہیں، کبھی گنا ہے تم نے، کتنے بچے ہو گئے۔۔۔؟ اسے زور کی کھانسی چھوٹی۔ آنکھوں کے کونوں سے پانی صاف کرتے ہوئے اس نے بات بڑھائی۔ مسائل کا بچوں سے کوئی تعلق نہیں، کم ہوں یا زیادہ، رزق اللہ سوہنے کے ذمّہ ہے۔ وہ دے رہا ہے، دیکھو بابو کامران کے دو بچے ہیں، وہ بھی لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ یہ بھید کسی نے نہ پایا۔

میری بات کو مذاق میں نہ ٹال۔ کل وہ آئی تھی، کیا نام ہے اس کا لیڈی۔۔۔۔! پھر۔۔۔؟

میں تو اب اور نہیں جن سکتی، بند کرا رہی ہوں۔ پرسوں لیڈی آئے گی تو اس کے ساتھ شہر بڑے ہسپتال چلی جاؤں گی۔۔۔

مت ماری گئی ہے تیری۔ درجن بھر بچوں کے بعد تجھے خیال آیا ہے۔ اچھا۔۔۔ آہستہ بول، شمو آ رہی ہے۔۔۔۔

شمو نے ان کے آگے چنگیر میں روٹی رکھی۔ ہونٹوں تلے دبی نسوار تھوکتے ہوئے شمو کی ماں نے کہا۔۔۔ کل سے شمو حویلی میں کام پر جائے گی۔

ٹھیک ہے۔۔۔! حقہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

اگلی صبح ماں کے ساتھ وہ حویلی پہنچی۔حویلی وہ پہلے بھی کئی بار آچکی تھی۔لیکن تسلّی سے دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔کمرے، راہداریاں، برآمدے، بیلیں، کمروں کی آرائش نے اسے حیران کر دیا۔قدآدم تصاویر، صوفے، نرم نرم گدے۔۔۔وہ صفائی کرتے کرتے سنگھار میز کے سامنے ٹھٹکی۔مالکن بستر پر دراز کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

سنگھار میز کا خیال رکھنا۔۔۔ٹوٹ نہ جائے۔۔۔رسالے سے نظریں ہٹائے بغیر مالکن نے کہا۔سنگھار میز پر رنگ رنگ کی شیشیاں، پاؤڈر، برش، پرفیوم، جانے کیا کیا رکھا تھا۔ایسی چیزیں تو اس نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔سنگھار میز کی درازیں بند تھیں۔وہ سوچ کی گلیوں میں بھٹکنے لگی۔جانے ان بند درازوں میں کیا ہے؟ تجسّس بھی کیسا انوکھا پرندہ ہے، معلوم سے نا معلوم جہانوں کو پرواز کرتا ہے۔دوسری ملازمہ کے ساتھ جب وہ بستر کی چادر بدلنے لگی۔۔۔تو نرم بستر کے لمس نے اسے چونکا دیا۔

سہ پہر جب وہ گھر لوٹ رہی تھی، دوپہر کا بچا سالن، روٹیاں اور تھوڑا سا میٹھا بھی ساتھ تھا۔

رات شمو جب موٹے بان کی چارپائی پر لیٹی تو نرم گدا اسے گدگدانے لگا۔اس کا جی چاہنے لگا۔میری چارپائی نرم بستر میں بدل جائے اور میں اس میں دھنستی چلی جاؤں۔کتنی دیر وہ آئینے کے سامنے کھڑی بنتی سنورتی رہی، نرم بستر میں دھنستی رہی۔۔۔آخر کار تھکن نے اسے سلا دیا۔

اس کے بعد وہ چوری چھپے آئینے میں اپنے گمشدہ عکس تلاش کرنے لگی۔اس کے بدن کے زاویے بولنے لگے۔مالکن کے دیئے ہوئے کپڑوں میں وہ خود کو نکھرا نکھرا محسوس کرتی۔اسے اپلوں کی آگ پر کھانا پکانے سے وحشت ہونے لگی۔نل کے تین اطراف چارپائیاں کھڑا کر کے اسے نہانا عجیب لگنے لگا۔اسے مالکن کا چمکتا ہوا غسل خانہ یاد آنے لگتا۔اسے خوشبوئیں اپنے بدن کے گرد لپٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔وہ بے تعبیر خواب بننے لگی۔مالکن کے سرہانے رکھے ملائم کاغذ والے رسالوں کی تصویریں اس سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

اس کا بابا تھریشر میں گندم ڈالنے میں مصروف تھا۔اور وہ اکیلی درختوں کے جھنڈ میں سیانے کے ہسپتال بھائی کو لے جا کر اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔اگو اپنے تیل سے چپڑے بالوں اور تعویذ سمیت موجود تھا۔وہ بھائی کے لئے گھڑونجی سے پانی ڈال رہی تھی۔اچانک شور ہوا۔

میاں جی آ گئے۔۔۔۔میاں جی آ گئے۔۔۔۔لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔
کار آ کر رکی، تو میاں جی کے ساتھ ایک نوجوان بھی اترا۔وہ کٹورا گھڑونجی پر رکھنا بھول گئی۔مالکن کے سرہانے رکھے رنگین رسالوں کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے۔شمو کار سے اترنے والے کوٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔
میاں جی کا بھتیجا ہے بھئی۔۔۔۔نگوڑی کرکٹ کھیلتے ہوئے گوڈے پر بال لگی۔میاں جی علاج کے لئے سیانے کے پاس لے آئے ہیں۔گاؤں کے ایک کسان نے درختوں تلے بچھی چار پائیوں پر بیٹھے گونگے لوگوں کو بتایا۔
"سلامی" لمبے قد، چوڑے کندھوں اور مضبوط ہاتھوں والی ایسی جی دار جوانی کی سرحد پر کھڑی تھی، جہاں انگڑائی لینے سے بدن ٹوٹ جاتے ہیں۔اس کا رنگ تانبے کی طرح چمکتا تھا۔وہ بچپن سے ہی حویلی کا حصہ تھی۔سب کو جھک جھک کر سلام کرتی۔سلام بڑے میاں جی، سلام بی بی جی۔۔۔۔گھر آئے مہمانوں کو باقاعدگی سے سلام کرتی۔ایک روز میاں جی نے ہنس کر کہا۔
"ٹوتو سلامی ہے۔۔۔۔سلامی"۔اسی دن سے اس کا نام سلامی پڑ گیا۔حویلی میں شہباز کے آنے سے شمو اور اس کے درمیان میٹھی کھسر پھسر ہونے لگی۔شمو کے گال سلامی کے بدن کی طرح چمکنے لگے۔اٹھتے بیٹھتے، کام کرتے وہ برتن توڑنے لگی۔بی بی جی کے کہنے پر جب وہ ناشتہ لے کر گئی تو کن اکھیوں سے شہباز کو دیکھتی رہی۔التفات کی متلاشی شمو کی آنکھوں میں رنگین خواب تیرنے لگے۔
سلامی نے اسے کریدا تو وہ ٹال گئی۔۔۔۔"نہیں، نہیں۔میرے دل میں کوئی چور نہیں۔تم ایویں مغز چاٹتی رہتی ہو۔۔۔۔وہ میرا کیا لگے گا؟"
شہباز کی نظریں اتنی بہت سی نوکرانیوں میں شمو کو کھوجتی رہتیں۔وہ رسالے کی اوٹ سے اس کے بدن کی سیر میں
کھویا رہتا۔وہ شکار کی تاک میں تھا۔تائی کی موجودگی اسے بری طرح کھٹکتی۔
ایک روز میاں جی شہر گئے تو شہباز کی تائی بھی ساتھ چلی گئیں۔سلامی جب ناشتہ لے کر کمرے میں گئی تو وہ اس کے چوڑے بدن کی طرف دیکھ کر بولا، شمو کہاں ہے۔۔۔؟
جی۔۔۔جی۔۔۔۔وہ باورچی خانے میں برتن مانجھ رہی ہے۔

اسے کہنا میرا کمرہ صاف کر جائے۔۔۔

جی۔۔۔!

ارے، پھپھے کٹنی، تُو تو کہتی تھی کوئی بات نہیں اور باؤ شہباز نے کہا ہے، شمو سے کہنا میرا کمرہ صاف کر جائے۔ سلامی نے اس کی ران پر چٹکی لی۔

کمرے کا کیا ہے، سلامی تُو کرے، میں کروں، کوئی کرے، کرنا تو ہے، نا۔ بہت سے کام نہ چاہتے ہوئے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ شمو کے گال سرخ ہو رہے تھے۔

شہباز برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔

شمو بستر کی چادر درست کر رہی تھی کہ کندھے پر ہاتھ کا لمس پا کر چونکی۔۔۔۔ ڈرو نہیں۔۔۔۔ میں ہوں۔

اس نے شمو کو کاندھوں سے پکڑ کر قریب کیا تو اس کا بدن ہاڑ کی تپتی دوپہر ہو گیا۔

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

باؤ جی۔۔۔ کوئی آ جائے گا۔۔۔

کوئی نہیں آئے گا۔

باہر مالی پودوں میں گوڈی کر رہا ہے۔۔۔ شمو کی سانس تیز تھی۔

رات کو حویلی کے پچھواڑے آ جانا۔ تم سے ایک بات کہنی ہے۔۔۔ شہباز نے اس کے کان میں جھولتے بندے سے کھیلتے ہوئے کہا۔

باؤ جی۔۔۔ ڈر لگتا ہے۔ آپ ابھی کہہ دیں۔۔۔

مالی کے کھانسنے کی آواز سن کر اس نے شمو کو چھوڑ دیا۔

رات جب اونگھنے لگی، گاؤں کی پگڈنڈیوں پر آوارہ کتے سو گئے۔ شمو تسلی کرکے گھر سے نکلی۔ حویلی کے پچھواڑے چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ وہ جیسے اندر داخل ہوئی، شہباز نے اسے بازوؤں میں بھر لیا اور اندر کمرے میں لے آیا۔

میرا یقین تھا تم آؤ گی۔

باؤ شہباز، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ جو بات کہنی ہے جلدی کہو، مجھے واپس جانا ہے۔

شمو ساری رات اپنی ہے۔

نہیں باؤ۔
شمو، میں تم سے شادی کروں گا۔
وہ یوں اچھلی جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہے۔۔۔۔شادی اور مجھ سے۔۔۔؟نہیں، باؤ یہ جھوٹ ہے۔

لذت کی جگہ خوف نے لے لی، کمرے میں لگی پینٹنگز گھومنے لگیں۔نرم بستر اسے چبھنے لگا۔میز پر رکھی ساری چیزیں کانپنے لگیں۔سگریٹ کی ڈبی، پانی کا گلاس، رسالے کے اوراق اور ٹائم پیس کی ٹک ٹک۔۔۔شہباز نے اسے سگریٹ سمجھ کر سلگانا چاہا، وہ بجھ گئی۔شہباز نے ماچس کی ساری تیلیاں پھونک دیں۔وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہی۔خوف اس کے دماغ کے خلیوں میں زہریلے کیڑے کی طرح رینگنے لگا۔وہ کیا کرے؟ چیخے، ہنسے، روئے یا بھاگ جائے۔۔۔وہ رسوائی کے خوف سے چیخ سکی نہ رو سکی۔۔۔باؤ۔نہیں، اللہ رسول کا واسطہ۔۔۔مجھے جانے دے۔

باؤ۔۔۔خدارا مجھے جانے دو۔۔۔دیکھو، شادی کے بعد پوری کی پوری تمہاری ہو جاؤں گی۔شمو کو جب فرار کی کوئی راہ نہ سوجھی تو اس نے شہباز کے منہ پر تھوک دیا اور دروازے کی طرف بھاگی۔
موری کا کیڑا۔۔۔شہباز نے تھوک منہ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔
شکار اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔وہ زخمی بھیڑیے کی طرح بل کھانے لگا۔
شہباز کو گئے کئی دن گزر گئے۔وہ اسے قریباً بھول گئی۔مردوں پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔اس کے خواب ٹوٹ گئے۔وہ بہت روئی، لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ آنسوؤں سے خواب نہیں جڑتے۔ایک دن برتن دھوتے ہوئے سلامی نے اسے کہا۔شمو، مجھے تم سے ایک کام ہے۔
کہو۔
پھر سہی۔
صبح تڑکے وہ کھیتوں میں رفع حاجت کے لئے اکٹھی نکلیں۔آسمان پر گہرے بادل اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔وہ دونوں گاؤں کے قریب ایک چھپر تلے رک گئیں۔بارش تیز ہو گئی۔
شمو!

ہوں۔

یاد ہے، ایک میں نے کہا تھا۔ مجھے تم سے ایک کام ہے۔ سلامی ایک تنکا توڑتے ہوئے بولی۔

یاد ہے۔

شمو، وعدہ کرو، جو بات تم سے کہہ رہی ہوں، اسے دل کے بکسے میں بند رکھے گی۔ کبھی بکسے کا تالا نہیں کھولے گی۔

کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہے۔۔۔ اب منہ سے پھٹ بھی۔ کسی سے آنکھ۔۔۔؟

نہیں۔۔۔ شمو نہیں۔۔۔ سلامی کا چہرہ راکھ ہو رہا تھا۔ اس نے شمو کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور سسک پڑی۔ شمو کے چہرے

پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

شمو۔۔۔ شم۔۔۔ مو۔۔۔ شادی کا جھانسہ دے کر شہباز کمینے نے مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔!

کیا۔۔۔؟ شمو کی چیخ اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئی۔

مجھے۔۔۔ دو مہینے کا پیٹ ہے۔۔۔

نہیں۔۔۔ سلامی۔۔۔ نہیں۔۔۔ شمو نے سر پیٹ لیا۔۔۔ وہ موری کا کیڑا۔۔۔ شمو دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔۔۔

میں زہر کھالوں گی۔۔۔ سلامی کے آنسو مٹی میں رل گئے۔

سلامی۔۔۔ حرام موت نہیں مرنا۔۔۔ ٹھہر، مجھے سوچنے دے۔۔۔

سلامی، تو اگو سے شادی کرلے۔ پرسوں ہی اگو کی ماں ہمارے گھر بیٹھی میری اماں سے کہہ رہی تھی۔ سلامی کی ماں مان جائے تو اپنے پت کے سر پر سہرا اسجا دیکھ لوں۔

لیکن۔۔۔ وہ تو تجھے پسند کرتا ہے۔

تو چھوڑ اس بات کو۔ میں اسے منالوں گی۔ ان مردوں کا کیا ہے۔

شمو جب اگو سے ملی، وہ حیران تھا کہ مجھے نفرت سے دیکھ کر تھوک دینے والی آج اتنی بچھی کیوں جا رہی ہے۔ تعویذ اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔

میں سلامی سے کیوں شادی کروں۔۔۔؟ تم اتنا اصرار کیوں کر رہی ہو۔ شادی تم سے کیوں نہیں۔۔۔؟ اگو نے مفلر سر پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

سلامی تجھ سے پیار کرتی ہے۔۔۔اور ٹوٹ کر۔۔۔ مجھے تو اس نے یہ کل ہی بتایا ہے۔۔۔اور تم مجھے پیار کرتے ہو۔اسی پیار کا واسطہ دیتی ہوں، میری سہیلی کی زندگی سنوار دے۔آج رات کنویں پر مجھے ملنا۔مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو۔اگو نے چلتے ہوئے کہا۔ٹھیک ہے۔۔۔! شمو نے کہا۔

چاندنی رات میں بھادوں کی خنکی تھی۔جھینگروں کی آواز میں سرگوشی کرتی شمو نے پوچھا۔۔۔

اگو۔۔۔کیا سوچا ہے۔۔۔؟

تو ناراض ہو جائے گی۔اگو نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

نہیں، اگو۔۔۔تو میری سلامی سے شادی کر لے۔میں تیری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔

شمو۔۔۔شمو۔۔۔آج رات میرے ساتھ گزار لے۔

سؤر ساری رات گنے کا کھیت اجاڑتا رہا۔چاندنی میلی ہوگئی۔

رات کے آخری پہر وہ اگو کے پہلو سے اٹھی۔۔۔وہ سرشار تھا۔شمو نے اگو کے منہ پر تھوکا اور کہا۔

''موری کا کیڑا'' اور کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆

کتاباں

اس کے خواب زرد تھے۔ وہ سوچتا رہا اس کے خواب زرد کیوں ہیں۔ پھر اسے خیال آیا، خزاں کے زرد پتوں اور اس کے خوابوں میں ایک خاص ربط ہے۔ اسے زرد اور اداس رتیں پسند ہیں۔ وہ گھر سے نکلا اور دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ چلتے چلتے وہ درختوں کے درمیان اپنے گرے ہوئے خواب ڈھونڈتا رہا۔ تھک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر وہ درختوں سے گرتے پتوں کی موسیقی سنتا رہا۔ اس نے ایک زرد پتا ہتھیلی پر رکھا۔ اسے غور سے دیکھا، پتے پر ابھری رگیں اسے کہانیاں سنانے لگیں۔ وہ کہانیاں سننے لگا۔ پہلا پتا، دوسرا پتا، تیسرا پتا، ان گنت پتے، لاتعداد کہانیاں۔ وہ کہانیوں کی تلاش میں ایسا نکلا کہ گھر کا رستہ بھول گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا ہے۔ اسے پتوں اور کہانیوں سے پیار ہو گیا۔ وہ پتے اور کہانیاں جمع کرنے لگا۔ اس شوق نے اسے زندگی کی راہوں میں چلنا آسان کر دیا۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ زرد پتے اس کی ہتھیلیوں پر کہانیاں بننے لگے۔ خزاں درختوں کے درمیاں کسے ڈھونڈتی تھی، اسے معلوم نہ تھا۔ ہلکی بارش میں اس نے ایک زرد پتا اٹھایا۔ سوچنے لگا، یہ بارش کے قطرے ہیں یا

آسمان کے آنسو۔ آسمان کیوں روتا ہے، آسمان کو کون سا دکھ ہے، وہ کیوں بلکتا ہے، پھر چھاجوں آنسو بہاتا ہے۔ پوری دھرتی کو بتاتا ہے کہ میں رو رہا ہوں۔ وہ زرد پتے کو ہتھیلی پر رکھے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا اور پنکھے کے ساکت پروں کو تکتا رہا۔

دستک ہوئی۔۔۔ خیالوں سے چونک کر اس نے حسبِ معمول کہا "Come in"۔ ہوسٹل میں سبھی ایسے ہی کہتے تھے۔

اس کے سامنے گیارہ بارہ سال کا ایک لڑکا جس کے کاندھے پر سرخ رومال اور پلاسٹک کے تھیلے میں نہ جانے کیا کچھ تھا۔

صاب۔۔۔" آپ سورۃ یٰسین خریدیں گے" پنسلیں بھی ہیں۔

مجھے کچھ نہیں خریدنا۔

صاب! لے لیں، دیکھیں، یہ سورۃ یٰسین ایک روپے کی ہے، یہ تو لے لیں۔

کہانا۔۔۔"نہیں لینی کوئی چیز"۔

یہ سب تم لوگوں کے بھیک مانگنے کے طریقے ہیں۔ چلو جاؤ، شاباش، تنگ نہ کرو۔

میں جھوٹ نہیں بول رہا، صاب۔ سچ کہہ رہا ہوں، میری ماں مر گئی ہے، باپ بیمار ہے، بس ایک جوان بہن ہے۔

لیکن ایسے کارڈ تو روز بسوں، ویگنوں اور ٹرینوں میں سفر کے دوران جھولیوں میں گرتے رہتے ہیں۔ ان میں کہاں تک سچ ہے، ہمیں کیا معلوم، عقیل نے کہا۔

لیکن صاب جی! میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں، میرے پاس تو پنسلیں ہیں، ربر ہیں، پنج سورۃ ہے، سورۃ یٰسین ہے۔ صاب، آپ لے لیں، ضرور لے لیں، میں بھیک نہیں مانگ رہا۔

عقیل نے ایک پنسل خرید کر تر کھانوں کی طرح کان میں اڑسی اور اسے بھول گیا۔ چھوٹے چھوٹے واقعات، حادثات ہمارے دروازوں پر دستک دیتے رہتے ہیں، ہم ان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ کب، کہاں کیا ہوا، اکثر بھول جاتے ہیں اور ایسے بھی ہوتا ہے کہ کبھی ہمیں چھوٹی چھوٹی باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔

اس روز دسمبر کی جھڑی لگی تھی۔ پورا ہاسٹل سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ دیواریں بارش سے دھل رہی تھیں۔ کمروں میں موسیقی، چائے، مونگ پھلی اور چلغوزوں کی آوازیں تھیں، باتیں تھیں، قہقہے

تھے، بے فکری تھی۔

عقیل نے اٹھ کر ہیٹر پر چائے کا پانی رکھا اور خود ایک ادبی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ان دنوں اس پر کرشن چندر کی موت کا گہرا اثر تھا۔ وہ ان داتا، غدار، ورق ورق کھوگئی زندگی میری، بار بار پڑھ چکا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا، کہ پارکر پین سے اجلی اجلی شفاف تحریریں لکھنے والا کرشن چندر چلا گیا۔ اسے ایک تسلی تھی، کہ دنیا میں سب لکھنے والے اپنی تحریروں میں زندہ رہتے ہیں۔ ان کا مادی وجود تو نہیں رہتا لیکن تحریریں انہیں زندہ رکھتی ہیں۔ کائنات میں ان کی سانسوں کی مہک رہتی ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

حسب معمول اس نے کہا "Come in"

وہ پھر اس کے سامنے تھا۔۔۔ پنسلیں، کاپیاں، ربر، کنگھیاں، پنج سورۃ، سورۃ یٰسین، سردی سے کانپتا جسم، ماتھے پر پسینے کی بجائے بارش کی بوندیں۔

صاب! سردی لگی ہے، بیٹھ جاؤں؟

جی نہیں۔

چپ کیوں ہو؟

بس ایسے ہی۔۔۔۔ صاب! ہمارے پاس باتیں نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ بکتی نہیں، ہم اپنے پاس صرف بکنے والی چیزیں رکھتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔

عقیل نے اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھ دی۔ چائے کی بھاپ کے ساتھ ساتھ اس کے اندر سے بھی بھاپ اٹھنے لگی۔ شاید وہ باتیں کرنا چاہتا تھا اور کوئی سننے والا نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس سب کچھ ہے لینے اور دینے کے لئے، لیکن شاید وقت کسی کو دینے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

کچھ کہنا ہے؟

جی نہیں۔

چپ کیوں ہو؟

بس ایسے ہی۔۔۔۔ صاب! ہمارے پاس باتیں نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ بکتی نہیں، ہم اپنے پاس صرف بکنے والی چیزیں رکھتے ہیں۔

عقیل اندر سے کانپ گیا۔اتنی گہری اور فلسفیانہ بات اس نے کیسے کہہ دی۔بولو، بولو۔میں تمہاری باتیں خریدوں گا۔تم خالی نہیں جاؤ گے۔اور پھر وہ بولنے لگا۔شاید اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس کی باتیں بکنے لگی ہیں۔غریب اور ستم رسیدہ لوگ کتنی جلد کسی کی بات کا یقین کر لیتے ہیں۔

صاب! ہم سچ مچ گھر کے تین فرد ہیں۔میرا باپ ٹی بی کا مریض ہے، وہ ساری عمر سڑکوں کے کنارے روڑی کوٹتا رہا۔ماں کو خون کی الٹیاں لگی تھیں، وہ مرگئی۔جوان بہن ہے، لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھتی ہے۔اس کے برتن مانجھنے سے گھر چلنا مشکل ہے، اب میں کچھ کمانے لگا ہوں تو آسانی ہوگئی ہے۔گھر کا گذارہ چل رہا ہے۔صاب! مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔سچ بہت شوق ہے، لیکن میں کیسے پڑھ سکتا ہوں۔میرے پاس کتابیں خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔لیکن صاب، میں پڑھوں گا، ضرور پڑھوں گا۔چائے ختم ہوچکی تھی۔باتیں بک رہی تھیں۔

صاب! جب میں اپنی چیزیں بیچنے سکولوں میں جاتا ہوں، تو ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنے بچے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔بہت سے سکولوں میں تو بچے کاروں پر بھی آتے ہیں، میں انہیں دیکھتا ہوں۔میرا اس لمحے دل چاہتا ہے، بھاگ کر ان کے ساتھ سکول کے اندر چلا جاؤں۔وہاں بیٹھ کر پڑھوں، میرے پاس کار نہ ہو، ایک سائیکل تو ہو، جس پر سکول آجا سکوں۔

صاب! آپ کو کیا بتاؤں، ایک دن ایک نیلی کار سکول کے گیٹ پر آکر رکی۔اس میں ایک خوبصورت میڈم بیٹھی تھیں۔پچھلی سیٹ پر ایک صاب بیٹھے تھے۔اگلی سیٹ پر ایک گول مٹول گورا چٹا بچہ۔۔۔میں بھاگ کر اپنی چیزیں بیچنے آگے ہوا تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے صاب نے مجھے جھڑک دیا۔اور بچہ ہنستا ہوا سکول کے اندر چلا گیا۔مجھے یوں لگا صاب وہ میں تھا، کیونکہ میری ماں کہتی تھی، سب بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔صاب، میرا نام معصوم ہے۔اس وقت میں سمجھتا تھا سب بچے میرے جیسے ہیں، پھر یہ بھی خیال آتا، اگر سب میرے جیسے ہیں تو یہ پنسلیں، سورۃ یٰسین اور کنگھیاں کیوں نہیں بیچتے۔صاب، ہمارے گھر کے قریب ایک سکول ہے، میری بہن نے وہاں بات کی ہے، وہ مجھے داخل کرلیں گے۔میں کتابوں کے لئے پیسے جمع کر رہا ہوں۔تین کتابیں خرید بھی لی ہیں۔میں پانچویں میں بیٹھوں گا۔وظیفے کا امتحان دوں گا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ زندگی کے کس کڑے امتحان سے گزر رہا ہے۔زندگی کا امتحان تو کمرہِ امتحان کے تین گھنٹوں سے کہیں زیادہ کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔بہت دن گذر گئے، وہ نظر

نہیں آیا۔اس دن ہاکی کا میچ عروج پر تھا۔عقیل کو وہ انسانوں کے ہجوم کے درمیان نظر آیا۔لوگوں کی نظریں اس کی چیزوں کی بجائے بال پر لگی تھیں۔نظریں بال کے ساتھ ساتھ اسی تیزی سے گھوم رہی تھیں۔عقیل نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔اس نے اپنا پلاسٹک کا تھیلا ایک طرف رکھا اور کہا۔

صاب!میں سکول گیا تھا۔

اچھا۔۔۔کب؟

صاب،میرا داخلہ ہو گیا ہے۔۔۔صاب،کل مجھے بہت مار پڑی۔

کیوں؟

صاب،میرے پاس حساب کی کتاب نہیں تھی۔ماسٹر صاب نے کہا تھا،جو بچہ کل کتاب نہیں لائے گا،اسے مار پڑے گی۔

توتم کتاب لے کر جاتے۔صاب،گھر میں جو پیسے تھے،ان سے صرف ایک چیز آسکتی تھی،میری کتاب یا بابا کی دوائی،جبکہ بابا کی دوائی میری کتاب سے زیادہ ضروری ہے۔

گول،گول۔۔۔۔زندہ باد۔۔۔۔گول،گول۔۔۔ہاؤ ہو،واویلا،کھلاڑی ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے،اچھل رہے تھے۔۔۔کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔۔۔عقیل کا ذہن کہیں اور تھا۔باپ کا سایہ قائم رکھنے کے لئے دوائی ضروری ہے،جو سایہ باپ دے سکتا ہے وہ کتاب نہیں دے سکتی،نا۔

میچ ختم ہو گیا ہے۔۔۔وہ لوٹنے لگے تو اس نے عقیل سے کہا۔

صاب۔۔۔۔

کیا پیسے چاہئیں؟

نہیں،صاب!میں بھیک نہیں مانگتا۔

تو پھر؟

ایک بات بولوں،آپ ہنسو گے تو نہیں؟

نہیں۔

صاب!کل جب مجھے ماسٹر صاب نے ہاتھ پر زور زور سے بید مارے تو نیل ابھر آیا۔مجھے یوں لگا،یہ نیل نہیں،نیلی کار ہے جس میں سے ابھی کوئی گول مٹول سا بچہ نکل کر بھاگ کر

سکول کے اندر چلا جائے گا۔۔۔

اتنی گہری باتیں نہ کیا کرو۔۔۔

عقیل نے اسے کتابوں کے لئے پیسے دینے کی کوشش کی، لیکن وہ بغیر لئے چلا گیا۔ عجیب بات ہے، جب وہ آخری بار عقیل کو ملا، خزاں کی رت تھی۔ عقیل بس میں کھڑکی والی طرف بیٹھا تھا۔ رینگتی بس میں اس نے چڑھنے کی کوشش کہ تو کنڈ یکٹر نے اسے دھکا دے کر اتار دیا۔ عقیل کو زرد پتے کی تلاش تھی۔ وہ زرد پتہ تھا۔ اس پر اس کی کہانی لکھی تھی۔ اسے اس نے اپنی زندگی کی کتاب میں رکھنا تھا۔ کنڈ یکٹر کو کیا معلوم، اس نے ایک بچے کو نہیں اتارا، کسی کی پوری زندگی اتار دی ہے۔ وہ سوچنے لگا، اسے اپنی زندگی دوبارہ تلاش کرنی ہوگی۔ بس تیز ہوگئی۔ عقیل کالج کے گیٹ کے سامنے اتر گیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے ٹیپ ریکارڈر پوری آواز کے ساتھ کھول دیا۔ سر کے نیچے دونوں ہاتھ دیئے نہ جانے وہ کن خیالوں میں گم تھا۔ کتنی دیر گذر گئی۔ کتنے لمحے بیت گئے۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر کرتے ہوئے اسے کتنی دیر ہوگئی۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا، کیونکہ وہ گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔

دروازہ کھلا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو زرد پتا اس کے سامنے تھا۔

☆☆☆

موم بتی اور دیا سلائی

وہ وقت کے مکان میں داخل ہوا۔ اس کے سامنے ماضی کے لاتعداد دروازے تھے۔ وہ چلتا گیا دروازے کھلتے گئے۔ ماضی کے مکان میں دروازے، کھڑکیاں، راہداریاں، پر پیچ راستے، بھول بھلیوں میں وہ بھولنے اور بھٹکنے لگا۔ اچانک ایک دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ لیکن جالی کے ادھ کھلے دروازے کے پیچھے دو آنکھیں انتظار اوڑھے کھڑی تھیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے بجائے لہو قطرہ قطرہ دہلیز پر اتر کر جم گیا تھا۔ اسے لگا یہ اس کی یادیں ہیں جو دہلیز پہ اس کی جانے کب سے منتظر بیٹھی ہیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، سارے دروازے کھڑکیاں ایک ایک کر کے بند ہو گئے تھے۔ بس وہی ایک دروازہ کھلا رہ گیا۔ اس روز بجلی نہیں تھی۔ وہ موم بتی اٹھا لائی۔ مدھم روشنی میں ڈرائنگ روم کا ماحول بڑا خواب ناک لگ رہا تھا۔ تم اتنے دن سے روٹھی روٹھی کیوں ہو۔ وہ اپنے ہاتھ میں جلتی ماچس کی تیلی دیکھتی رہی اور کچھ نہ بولی۔ تیلی جب بجھنے لگی، اس نے دوسری جلالی۔ وہ تسلسل سے تیلیاں جلانے اور ان سے کھیلنے لگی۔

تم اپنے ناخنوں سے نیل پالش اتار کر دیکھو۔ میں نے ہر ناخن پر ایک تحریر لکھی تھی۔ تمہارے ہاتھوں کی ساری لکیروں میں مَیں نے لمحے پرو دیئے تھے۔

میرے سارے ناخن ٹوٹ گئے ہیں۔ اور ان پر تمہاری کوئی تحریر نہیں ہے۔ وہ بدستور شعلے سے کھیلتے کھیلتے بولی۔

اور جو یادیں میں نے تمہارے ہاتھوں کی لکیروں میں پروئی تھیں۔۔۔؟

ایک رات ایک لکیر کا دھاگہ ٹوٹ گیا، میں موتی موتی تمہاری یادیں گم کر بیٹھی ہوں۔ ایک بار تم نے کہا تھا۔

میں نے کیا کہا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔

لیکن میں اس گرم دوپہر کی ٹھنڈی چادر کو کیسے بھول سکتا ہوں جس پر تم نے اپنی باتوں سے اتنے پھول کاڑھے تھے کہ پھر آنے والے برسوں میں یہ چادر اوڑھے میں سارے ذائقے محسوس کرتا رہا۔ اسی دوپہر میں نے تم سے پوچھا تھا۔

میں جب کوئی چیز تمہیں تحفہ دیتا ہوں تو کیا محسوس کرتی ہو۔۔۔؟

اچھا نہیں لگتا، برا محسوس کرتی ہوں۔

کیوں؟

وہ تھوڑی دیر چپ رہی اور پھر کہا۔

کیا آپ کافی نہیں ہیں۔

تم زندگی میں پیار کا ایک لفظ نہ کہو، تمہاری کوئی ادا میرے لئے نہ رہے، میں اسی ایک فقرے کے حسن میں زندگی گزار لوں گا اور تمہیں یہ بھی یاد ہوگا، میں نے اپنا نام کیوں بدل لیا تھا۔

وہ خاموش رہی۔ ماچس کی تیلیاں بولتی رہیں۔ شعلہ کہانی سناتا رہا۔ ایک تیلی بجھنے لگتی تو وہ جھٹ سے دوسری جلا لیتی۔ وہ بتا رہی تھی کہ میں بھی تمہارے غم میں اسی طرح بجھ رہی ہوں۔ خاموش زبان، بولتی تیلیاں، ماچس خالی ہوتی رہی۔ موم بتی کے سرہانے ادھ جلی تیلیوں کے اجسام کی مہک تھی۔

میں نے ماضی بھلا دیا ہے۔ ناخنوں سے کھرچ دیا ہے۔

غلط کہتی ہو۔ اگر تم نے ماضی کو ناخنوں سے کھرچا تو یہ زخم تمہیں اور تکلیف دے گا۔

ماضی عذاب ہے، جب ہم کسی کو پیار کریں اور حاصل نہ کر سکیں تو یادِ ماضی عذاب ہو جاتی ہے۔ میرے سامنے صرف حال ہے وہ بھی لرزتا۔ اور میرے اندر کی روشنی اتنی کمزور ہے کہ مستقبل میں جھانک نہیں سکتی۔ ماضی عذاب، حال بے حقیقت، مستقبل نامعلوم، جانے ہم زندہ کیسے رہتے ہیں۔ اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ آنکھیں موند لیں اور اس کے بدلتے رویوں پر سوچنے لگا۔ سچ کہتی ہے۔

اس کی آنکھ کھل گئی اور اسے یہ سب خواب لگا۔ میں ابھی تک سو رہا ہوں اور سارے منظر میرے ہیں۔ میں جاگنا بھی نہیں چاہتا۔ میں نیند کے سفر میں عمر گزار لوں گا۔ اس کی طرح میں جاگ گیا اور مجھے بھی ماضی خواب لگا تو میں مستقبل کے ماتھے پر اپنے دکھ کس کے نام لکھوں گا۔ وہ کہتی ہے مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ لیکن اس کا وجود بولتا ہے، ہاتھ بولتے ہیں، زلفیں بولتی ہیں، ابرو بولتے ہیں، پلکیں بولتی ہیں، میں حیران ہوں۔ پریشان اس لئے نہیں کہ وہ کسی اور سے پیار نہیں کر سکتی۔ کہیں وہ یہ تو نہیں چاہتی کہ میں اسے بے وفا سمجھ کر بھول جاؤں۔ لیکن اس نے کہا تھا کہ اس شہر میں بے وفائی کا تصور ہی نہیں ہوتا تو میں کیسے مان جاؤں؟ وہ تو دیارِ نور میں تیرہ شبوں کی ساتھی تھی۔ وہ تو میری وحشتوں کی ساتھی تھی۔ میں جی لوں گا مگر کیسے؟ جی وہ بھی لے گی، مگر کیونکر؟ جب بے وفائی کرنے والے ایک دوسرے کے بغیر جی سکتے ہیں تو پھر وعدوں کے گھروندے بنانے سے فائدہ۔ بس ملا کریں، ہنسا کریں، باتیں کیا کریں اور جب بیٹھا کریں تو کوئی ملال نہ ہو، کوئی دکھ نہ ہو، گرہ میں کوئی یاد نہ ہو۔ جب زندگی کے ہنگاموں میں کھو کر ہم جی سکتے ہیں تو پھر زادِراہ کے لئے یادیں کیا ضروری ہیں؟ کسی کی یادوں کو مقید نہیں کرنا چاہیئے۔ اس نے بہت اچھا کیا، ماضی کو بھلا دیا۔ دل سے میری یادوں کو رنگین پنجرے میں بند رنگ برنگے پرندوں کی طرح آزاد کر دیا۔ میری یادیں ساری عمر اسے دعا دیتی رہیں گی۔ لیکن کیا کیا جائے، میں نے ایک شب کوشش کی، ساری رات اپنے دل کا قفل توڑتا رہا، میرے ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے، خون رسنے لگا، لیکن قفل نہیں ٹوٹا۔ میرا ابھی جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کی یادوں کو آزاد کر دوں۔ اگر کبھی میں نے قفل توڑ بھی لیا تو میرا خیال ہے اس وقت تک اس کی یادوں کے رنگین پرندے میرے دل کے پنجرے سے اتنے مانوس ہو چکے ہوں گے کہ دروازہ کھلنے پر بھی کہیں اور اڑ کر نہیں جائیں گے۔ جانے میں کتنی دیر یاد کے برزخ میں رہا۔ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے میں نے آنکھیں کھولیں

تو سامنے چائے کی پیالی رکھی تھی۔ پیالی پر الٹی پرچ رکھی تھی اور کمرے میں اس کی خوشبو تھی۔ جانے وہ کب چائے رکھ گئی تھی۔ میں نے پرچ اٹھائی تو چائے کے بجائے ایک چٹ کی زبان پر یقین کے آنسو تھے۔" میں صرف تمہاری ہوں اور یاد رکھنا اس سفر میں بے وفائی کا تصور ہی نہیں ہوتا" ابھی وہ حیرت میں تھا کہ وہ چائے لئے اندر داخل ہوئی۔ پیالی اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس کی سانسوں اور چائے کی خوشبوئیں کہانی لکھنے لگی۔

ابھی تو پیالی میں ایک چٹ تھی۔

وہ تمہارا ماضی تھا۔

اگر ماضی تھا تو تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ ماضی تھا۔ تم تو ماضی کو بھول چکی ہو۔ وہ چونکی اور" آنسوؤں کے ریموور سے ناخنوں سے نیل پالش اتارنے لگی۔"

☆☆☆